رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

# نگار

قیمت

۸ر

نگار پبلک ایجنسی لکھنؤ

# تصانیف نیاز فتحپوری

[illegible]

## نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول

## جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲-افسانے ۳۲ مقالے درج ہیں۔ زبان قدرت بیان علو تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ/)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

## مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (ع۸/)
علاوہ محصول

## شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کا تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشا رعالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول

## اُردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانے کے شعرا پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات - قیمت عہ/ علاوہ محصول

## ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اُردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے - قیمت علاوہ محصول ع۸/

## "نگار" جنوری سنہ ۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف" یہ ڈرامہ مصری انشاپرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشا و تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اُس نے سارہ (مشہور ایکٹریس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب انشا میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشا و ندرت بیان کے لحاظ سے یورپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اُس کا اندازہ آپ ان خطوں سے کر سکتے ہیں (۳) "مسئلہ خلافت و امامت" آزاد خیال شیعی کے قلم سے۔ مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و لاینحل سہی پھر بھی اس سلسلہ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پانچواں مقالہ ہے اس کے بعض عنوان یہ ہیں: مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات - نفس مسئلہ خلافت - مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ

صفحات ۱۴۴ - قیمت عہ/ علاوہ محصول

# نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

| جلد ۳۵ | فہرست مضامین جون ۱۹۳۹ء | شمار ۶ |
|---|---|---|


| | | |
|---|---|---|
| ملاحظات | اڈیٹر | ۲ |
| سرزمین ہند کی ایک روایت حسن وعشق | عبدالمالک آروی | ۹ |
| ایک دن سولینی کے ساتھ | اڈیٹر | ۱۹ |
| کانفرنس، کونسل، بیٹیاں | رشید احمد صدیقی ام۔اے | ۲۴ |
| آرایش جمال | خواجہ احمد فاروقی۔بی۔اے | ۳۰ |
| چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے | اڈیٹر | ۳۶ |
| دول عالم کی بری، بحری اور میکانکی قوت | " | ۴۲ |
| تاریخ اودھ کا ایک ورق | شیخ تصدق حسین | ۵۱ |
| باب الاستفسار | اڈیٹر | ۵۵ |
| مکتوبات نیاز | " | ۵۸ |
| باب المراسلۃ والمناظرۃ | " | ۶۲ |
| مطالعۂ فطرت | " | ۶۸ |
| کیا آپ کو معلوم ہے | " | ۷۲ |
| منظومات | ماہر القادری، ناظر، سروش، کاوش | ۷۵ |

# نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

| جلد ۳۵ | جون سنہ ۱۹۳۹ء | شمار ۶ |
| --- | --- | --- |

## ملاحظات

### مذاہب کی واہمہ پرستیاں

کل ایک بزرگ تشریف لائے اور عجیب و غریب بحث چھیڑ دی۔ ان کا ذہن جن خیالات سے متاثر تھا ان کا خلاصہ یہ تھا کہ:- کہنے والے کہتے ہیں خدا مستجاب الدعوات ہے لوگوں کی دعائیں سنتا ہے، غریبوں کی فریاد کو پہونچتا ہے، اس نے آدم کی گریہ و زاری کو سنا اور کھوئی ہوئی جنت کے عوض اس سے بہتر فردوس کا وعدہ کرکے ان کے آنسو پونچھے، یعقوب کی سرشک آلود آنکھوں کو دیکھا اور ان کے یوسف گم گشتہ کو پھر ان کی آغوش تک پہونچا دیا، وہی تھا جس نے نوح کو طوفان سے زندہ و سلامت نکالا، آتش نمرود کو ابراہیم کے لئے گل و گلزار بنا دیا، یونس کو بطن ماہی کے اندر فنا نہ ہونے دیا، موسیٰ کی حمایت میں فرعون کو غرق کیا، مسیح کو دوبارہ زندہ کرکے اپنے پہلو میں جگہ دی اور محمد کو ان کی دعائے نیم شبی کے عوض کونین اٹھا کر دیدئے ہیے لیکن جس وقت ہم خود اپنے ذاتی احساس و تجربہ کی دنیا میں، اس عقیدہ کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہماری سمجھ میں کچھ

نہیں آتا کہ یہ "روایتی خدا" واقعی ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی حقیقت و نوعیت کیا ہے۔

آج انسانیت جس دورِ اضطراب سے گزر رہی ہے، اس نے نوح کے طوفان کو بھلا دیا ہے، آتش نمرود اس کے سامنے ایک چنگاری کی سی حیثیت رکھتی ہے، بنی اسرائیل پر جو مظالم روا رکھے گئے ان سے زیادہ ظلم اب دنیا پر ہو رہا ہے، محمد کے زمانہ میں جس بت پرستی نے اخلاق انسانی کا خون کر رکھا تھا اس سے زیادہ صداقت سوز صورتیں اس وقت پیدا ہیں، غریبوں کی فریاد، مظلوموں کی کراہ اگر پہلے ہزاروں تک محدود تھی تو اب کروروں تک پہونچ گئی ہے، پہلے آگ جسم سے شروع ہوتی تھی اور وہیں ختم ہو جاتی تھی، اب یہ شعلے دل سے اٹھتے ہیں اور جسم و جان دونوں کو پھونکے ڈالتے ہیں۔ لیکن نہ خدائی قہر و غضب میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ اس کا دریائے رحمت جوش میں آتا ہے۔ یہ سنکر میں نے ان کو جو جواب دیا وہ زیادہ تر فکاہی حیثیت رکھتا تھا، لیکن ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کیا یہ ذہنی گمراہی ہماری مذہبی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے اور کیا دلوں میں ایسے شکوک پیدا ہونے کی ذمہ داری مذہب پر نہیں؟ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خود ہی ایک مفروضہ اپنے ذہن سے پیدا کرتا ہے اور جب تجربہ سے اس کے نتائج خلاف امید ظاہر ہوتے ہیں تو وہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں پر الزام رکھتا ہے۔ اس نے آپ خدا کا ایک مفہوم مقرر کیا اور جب خدا ویسا نہ نکلا جیسا اس نے سمجھا تھا تو اپنی غلطی تسلیم کرنے کی جگہ خدا کی طرف سے بدگمانیاں پیدا کرنے لگا یعنی خدا کو وہ ویسا ہی سمجھے جائے گا جیسا وہ سمجھ چکا ہے، خواہ خدا کی خدائی رہے یا نہ رہے۔

خدا کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس مسئلہ پر انسان اپنی مجبورانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر غور کرتا رہا ہے اور اس لئے وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی کا سہارا ڈھونڈھ کر اپنی جدوجہد کی مصیبتوں کو کم کر دے، اور یہیں سے وہ خدا وجود میں آجاتا ہے، جس سے ہم اپنی ناکامیوں پر بازپرس کر سکتے ہیں لیکن اگر انسان اپنی قوت عمل کو اصل چیز قرار دیکر خدا کا مفہوم متعین کرے تو شاید خدا خود اس کو اپنے اندر ہی نظر آئے اور وہ اپنی ہی عملی زندگی کی اصلاح و درستی کی طرف مایل ہو۔

سوچتے سوچتے جب میرے سامنے مذاہب عالم کی تاریخ آئی اور ان معتقدات کی تفصیل جن کو مذہب نے دنیا سے تسلیم کرایا ہے تو میرے ذہن نے زیادہ عمیق فلسفیانہ رخ اختیار کیا، ایک بے لاگ انتقادانہ کیفیت میرے اندر پیدا ہوئی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہگیا کہ اگر مذاہب کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی بنیاد سوائے واہمہ پرستی کے اور کچھ نظر نہیں آتی۔

سب سے بڑی واہمہ پرستی جو سرچشمہ ہے اور بہت سے اوہام کا معجزہ کا اعتقاد ہے۔ معجزہ نام ہے ایسے فعل کا جو قوانین فطرت کے خلاف ہو یعنی اگر کوئی شخص ایسا دائرہ بنا سکے جس کا قطر اس کے

محیط کا نصف ہو تو یہ اقلیدس کا معجزہ کہلائے گا، اگر ہم دو اور دو کے مجموعہ کو پانچ ثابت کر دکھائیں تو یہ دنیا، ریاضی کا معجزہ ہوگا، اگر کوئی شخص بلندی سے کوئی پتھر گرائے اور پہلے سکنڈ میں اس کی رفتار دس فیٹ ہو، دوسرے سکنڈ میں ۲۵ فیٹ اور تیسرے سکنڈ میں پانچ فیٹ تو یہ طبیعیات کا معجزہ کہلائے گا، اگر ایک آدمی ہائڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن کو ملاکر سونا طیار کرے تو یہ علم الکیمیا کا معجزہ ہوگا، اگر کوئی حکومت چاندی کے سکّہ کو سونے کا سکّہ بنا سکے تو یہ فنانس کا معجزہ ہوگا۔ اس طرح ایک چوکور مثلث بنانا، آئینہ کی پشت پر کھڑے ہونے والے کا عکس آئینہ میں دکھا دینا، آواز بازگشت سے علاوہ اپنی آواز کے کوئی اور آواز پیدا کرنا، الغرض قدرت کے مقررہ قوانین کے خلاف کوئی بات کر دکھانا معجزہ کہلائے گا، لیکن اسوقت جبکہ فطرت کے قوانین اٹل سمجھے جاتے ہیں اور تمام ذہنی ترقیوں کا انحصار اس پر ہے، کیا آپ میں اس کی ہمت ہو سکتی ہے کہ ایسا دعویٰ کریں اور کیا کوئی اس کا یقین کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو انسان ہی نے پیدا کیا اور بڑی حد تک اپنی ہی طرح اسے انسان سمجھا۔ عہد وحشت کے انسان نے جو تصور خدا کا پیش کیا اس میں بھی وہی وحشت و درندگی پائی جاتی تھی، اس کے بعد جب انسان نے کچھ ترقی کی تو خدا بھی ایک حد تک ترقی یافتہ ہوگیا، اس کی وحشت کم کر کے تھوڑا سا رحم بھی اسکے دل میں ڈالدیا گیا، جب انسانی ذہن و خیال میں اور زیادہ وسعت پیدا ہوئی تو خدا بھی زیادہ منصف زیادہ رحم کرنے والا اور زیادہ مقدس ہوگیا۔ یہاں تک کہ مسیح تشریف لائے اور انھوں نے خدا کو سراپا رحم و محبت ظاہر کیا۔ لیکن زلزلے برابر آتے رہے وبائیں بدستور پھیلتی رہیں، قحط برابر پڑتے رہے اور لاکھوں آدمی تڑپ تڑپ کر جان دیتے رہے۔ اس کی تاویل مذہب والوں نے یہ کی کہ یہ تباہیاں، یہ مصائب سب انسان ہی کی فلاح کے لئے ہیں، کیونکہ لذت و تنعم عیش و راحت اخلاق خراب کر دیتا ہے۔ لیکن کیا یہ باتیں اس زمانہ میں بھی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں؟ ہم جانتے ہیں کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا۔ ہم کو معلوم ہے کہ نیکی کبھی بدی ہو سکتی ہے اور نہ بدی نیکی یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ تاریکی کسے کہتے ہیں اور روشنی کیا ہے لیکن یہ کبھی نہیں مان سکتے کہ نیکی و بدی کی تعیین و تحدید خدا کی طرف سے ہوئی ہے، بلکہ ہمکو ہماری ضروریات زندگی نے بتایا ہے ہماری معاشرت کے تجربات نے سکھایا ہے اور آیندہ بھی اصول اخلاق میں جو تغیرات پیدا ہوں گے وہ ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہوں گے اور ہماری ہی ضروریات تمدن سے متعلق ہونگے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ معتقدات مذہبی سے ہم کو کیا نقصان پہونچتا ہے، اگر ہم دوزخ و جنت، حور و قصور، جن و ملک، معجزہ و خرق عادات وغیرہ پر عقیدہ رکھتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے جب کہ ان عقاید کا مقصود بھی اصلاح اخلاق ہے۔ بظاہر یہ بات قرین عقل معلوم ہوتی ہے، لیکن فی الحقیقت ان

عقاید کے نقصانات حد درجہ مہلک ہیں۔

یہ معتقدات چونکہ یکسر روایات پر مبنی ہیں اور عقل و درایت کا ان سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے ان کو صحیح سمجھ لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن حقایق کی جستجو سے منحرف ہو جاتا ہے، اسباب و نتایج کے رابطہ کو سمجھنے کی اہلیت ہم میں باقی نہیں رہتی، انسان کے تمام قویٰ ذہنی مضمحل ہو جاتے ہیں اور ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

پھر اگر خدا کا تصور ہمیشہ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے تو اب بھی اس کو بدلنا پڑے گا اور اگر مذہب انسان کے لئے ضروری ہے تو اس کے اُصول بھی وہی مقرر کرنے ہوں گے جو ہمارے لئے مفید ہوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم قدرت کا مفہوم اس کے قوانین سے قطع نظر کر کے متعین کریں، اگر خدا ہے تو یقیناً وہ ان اصول کا بھی پابند ہے جو اس نے وضع کئے ہیں اور اگر وہ ان اُصول سے منحرف ہو سکتا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم بھی اس سے منحرف ہو سکتے ہیں اور رشتۂ عبد و معبود کبھی استوار نہیں ہو سکتا۔

خدا کا وجود فی نفسہٖ نہ خلافِ عقل ہے نہ مضرت رساں۔ لیکن ہمارا نفع و ضرر اس کے تصور کی نوعیت سے ضرور متعلق ہو جاتا ہے۔ اگر ہم خدا کو ایک ایسی قوت مان لیں جو کائنات کے نظام تخلیق و ارتقا میں کارفرما ہے تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اگر ہم اس کا تصور ایک دنیاوی بادشاہ کی طرح کریں کہ وہ کسی سے خوش ہو کر نہال کر دیتا ہے اور کسی پر غضبناک ہو کر تباہ، تو بیشک یہ تصور غلط، مضرت رساں اور مانع ترقی ہوگا۔

ہر چند خدا کے اس جدید تصور سے انبیاء و رسل، صحف مقدسہ، حیات بعد الموت، دوزخ و جنت ملایکہ و شیاطین، حشر و نشر، عذاب و ثواب سب ختم ہو جائیں گے یا ان کی کوئی عقلی توجیہ و تاویل کرنا ہوگی، لیکن اس کا کوئی علاج نہیں، ہم کو ان مروجہ عقاید اور خدا دونوں میں سے ایک کو لینا ہے اور غالباً یہ زیادہ آسان ہوگا کہ خدا کے مقابلہ میں ان معتقدات کو پس پشت ڈال دیا جائے اور بقاء مذہب کی ہلکی سی ہلکی جو صورت ہو سکتی ہے اس پر قناعت کی جائے۔

میں اس سے قبل بھی بارہا لکھ چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جب تک مذہب کا وجود باقی ہے دنیا کا امن و سکون خطرہ میں ہے، یہ ہو نہیں سکتا کہ تمام کرۂ ارض پر ایک ہی مذہب کے ماننے والے پائے جائیں اور مذاہب کا اختلاف حقیقتاً دلوں کا اختلاف ہے جس سے جذبۂ منافرت پیدا ہونا ضروری ہے یہ بالکل درست ہے کہ مذہب کے فنا ہونے کے بعد بھی جنگ و جدال یقیناً قایم رہے گی، لیکن یہ اختلاف ہمارے قوائے ذہن کو مضمحل کرنے والا ثابت نہ ہوگا بلکہ مدافعت و حفاظت کا جذبہ ہمیں زیادہ حرکت و عمل پر آمادہ کریگا

اور ہو سکتا ہے کہ آخر کار تمام نوع انسانی کسی ایک مرکز پر جمع ہو کر ان مادی اختلافات کو دور کر دے، لیکن مذہب کے ہوتے ہوئے اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

**ہماری موجودہ سیاسیات**

اس میں شک نہیں کہ جن صوبوں میں کانگرس حکومت قایم ہوئی ہے وہاں ہندو مسلم اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں اور وہ توقعات جو ملک نے اس حکومت کی طرف سے قایم کی تھیں پوری نہیں ہوئیں۔ اس کا سبب خواہ ہندو عوام کی ذہنیت کا انقلاب ہو، یا ارباب حکومت کی کمزوری، بہر حال یہ ایک واقعہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ تجربہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور حکومت بدستور اغیار کے ہاتھ میں رہنا چاہئے انتہائی کم ہمتی کی بات ہے۔

ملک میں جب کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے تو اس نوع کے سنگ گراں اکثر راہ میں حایل ہوتے ہیں اور ان کو دور کرنے کے بعد ہی ہم منزل تک پہونچ سکتے ہیں، اس لئے ہر دو فریق کو اپنی جگہ سوچنا چاہئے کہ ان شکایتوں کے اسباب کیا ہیں، اور ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

جس طرح کانگرسی صوبوں میں مسلم اقلیت کو شکایت ہے اسی طرح بنگال میں جہاں مسلم اکثریت ہے، ہندو اقلیت شاکی نظر آتی ہے اور لطف یہ ہے کہ دونوں جگہ اس کا اثر مذہبی نقطۂ نظر سے لیا جاتا ہے۔ کانگرسی صوبوں میں مسلمان کہہ رہا ہے کہ ہندو ہمارے کلچر کو تباہ کر رہے ہیں، ہماری زبان کو مٹائے دیتے ہیں، ہماری مذہبی آزادی پر حملہ کرتے ہیں اور بنگال میں ہندو بھی یہی کہتا ہے کہ مسلم اکثریت ہمارے کلچر، ہمارے مذہب اور ہماری زبان کو نقصان پہونچا رہی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اختلافات برابر بڑھتے جاتے ہیں اور ملک کی آزادی کا مسئلہ دشوار طلب ہوتا جاتا ہے۔

مسلم لیگ میں بھی اسی گمراہ تبلیغ سے دوبارہ زندگی پیدا ہوئی اور آریہ سماجیوں کا یہ زور و شور بھی اسی غلط پروپاگنڈا کا نتیجہ ہے۔ مسلم لیڈر بھی یہی شور مچا رہے ہیں کہ ہمارا مذہب تباہ ہوتا جاتا ہے اور آریہ سماجی بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کا دھرم خطرہ میں ہے اور اس طرح آزادی ہند کا مسئلہ بالکل مذہبی تنگ نظری میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔

ہندوستان کے سامنے اسوقت سوال نہ مذہبی بربادی کا ہے نہ کلچر و زبان کی تباہی کا بلکہ وہ مشترک مصیبت جس میں ہندو مسلمان دونوں مبتلا ہیں اقتصادی تنگ حالی اور ذہنی بے مایگی ہے۔ دونوں کھانے کو محتاج ہیں اور دونوں جاہل ہیں۔ شہروں میں ہندو یقیناً مسلمانوں سے زیادہ متمول و خوشحال ہیں لیکن گاؤں میں ہندو مسلمان دونوں یکساں فاقوں مر رہے ہیں اور چونکہ وہاں ہندو آبادی زیادہ

ہے اس لئے شہر اور گاؤں کو ملا کر ہندو مسلمان دونوں کی اقتصادی و تعلیمی پستی کا اوسط ایک سا رہتا ہے اور اس لئے دونوں کو ملکر سب سے پہلے اسی مصیبت کو دور کرنا چاہئے۔

چونکہ ہندوستان مذہب کی بلا میں بھی مبتلا ہے اس لئے کانگریسی حکومتوں میں ہندو آبادی کو یہ زعم پیدا ہو چلا ہے کہ غیر ہندو جماعتوں کو دبانے کا حق اسے حاصل ہو گیا ہے اور یقیناً نہایت خطرناک غلطی ہوگی اگر ان کے اس خیال کو اور زیادہ مستحکم ہونے دیا۔ اسوقت کانگریسی حکومتوں میں یو۔پی اور صوبہ متوسط اس باب میں زیادہ بدنام ہیں اور اس بدنامی کی وجہ بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ عنان وزارت مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے جو خود بھی اس مسئلہ کو زیادہ بلند نظری سے نہیں دیکھتے۔

مہاتما گاندھی یہ تو بار بار کہتے ہیں کہ کانگرس سے اس عنصر کو علٰحدہ کر دینا چاہئے جو فتنہ و فساد کا باعث ہے، لیکن ان کا روئے سخن سوشلسٹ جماعت کی طرف ہوتا ہے اور خود ان کی مذہبیت ان کو یہ سوچنے کا موقعہ نہیں دیتی کہ اگر واقعی اس عنصر کو کانگرس سے علٰحدہ کر دیا گیا جو اس اختلاف و نزاع کا باعث ہے، تو یہ عنصر وہی ہوگا جس کو وہ اپنا کہتے ہیں اور جس کا سر رشتہ ان کے محبوب سردار پٹیل کے ہاتھ میں ہے۔

مسٹر بوس کا فارورڈ بلاک، بنا کر تمام آزاد خیال پارٹیوں کو شرکت کی دعوت دینا یقیناً فال نیک ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ان کی جد و جہد آخر میں صرف بنگال اور بنگال منسٹری تک محدود نہ رہ جائے۔

برطانوی حکومت اس وقت نہایت خاموشی کے ساتھ ان تمام حالات کا مطالعہ کر رہی ہے اور جسوقت تک فیڈریشن قایم نہیں ہو جاتا، وہ کسی قسم کی مداخلت پسند نہ کرے گی۔ البتہ اگر اس دوران میں کسی طرح کانگرس کی سوشلسٹ پارٹی برسر اقتدار ہوگئی جو قیام وفاق کی سخت مخالف ہے تو وہ دخل در معقولات کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرے گی اور یہی وہ وقت ہوگا جب صحیح معنی میں یہاں عملی انقلاب کا آغاز ہوگا۔ بہرحال اسوقت تک کہ مہاتما گاندھی زندہ ہیں برطانیہ کو کوئی فکر نہیں ہے وفاق کے قیام میں بھی کوئی زحمت نہ ہوگی اور فوجی بھرتی کے لئے بھی کوئی دقت نہ اٹھانا پڑے گی، اور یہی سبب ہے کہ سوشلسٹ جماعت کے کھیل بن بن کر بگڑ رہے ہیں، بہرحال آزادی ملک کا مسئلہ اول تو مہاتما گاندھی جی کی سہولت پسندی کی وجہ سے تعویق میں پڑا ہوا ہے اور دوسرے ہندو مسلم اختلاف نے اس کو عسیر الحصول بنا رکھا ہے، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کچھ زمانہ تک اور ہندوستان کو غلامی کی زندگی بسر کرنا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ میعاد اور کتنی طویل ہو جائے گی، اگر سیاسیات میں ہمارے مذہبی رجحان کا یہی عالم رہا

## بے غیرتی و بے حسی کی انتہا

ہندوستان کی مسلم تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا ناپاک باب نظر آئے، جیسا اس وقت شیعہ سنیوں کی مخالفت نے لکھنؤ میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے اکابر نے جس ذلیل ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اور ہماری صحافت نے جس دنائت وسخافت کو پیش کیا ہے وہ شرافت و انسانیت کی پیشانی کا ایسا داغ ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا اور اگر مسلمانوں میں کچھ بھی غیرت باقی ہو تو وہ اب دنیا کی کسی قوم سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

پہلے سنیوں کو اصرار تھا کہ وہ مدح صحابہ کا جلوس ضرور نکالیں گے، خواہ شیعوں کو اس سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہونچے اور اب شیعوں کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ صحابہ کو ضرور برا کہیں گے خواہ ان کی یہ ضد کتنی ہی خلافِ انسانیت کیوں نہ ہو۔ پھر لطف یہ ہے کہ دونوں ایک ہی خدا، ایک ہی رسولؐ کے ماننے والے ہیں اور جھگڑا ان لوگوں کی بابت ہے جن کو گزرے ہوئے صدیاں ہو چکی ہیں اور اب کبھی وہ اس دنیا میں نہیں آ سکتے۔

روایات و قیاسات کی بنا پر شاید ہی ایسی ذلیل مخالفت دنیا کی کسی دو قوموں میں پائی گئی ہو جیسی شیعہ سنیوں میں پائی جاتی ہے۔

اسوقت تک گیارہ ہزار شیعہ جیل جا چکے ہیں اور یہ مسئلہ اس قدر اُلجھ گیا ہے کہ اس کے سلجھانے کی کوئی صورت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جب سنی مدح صحابہ پڑھ پڑھ کر جیل جا رہے تھے تو وہ بھی اپنے آپ کو مجاہد کہتے تھے اور اب شیعہ صحابہ کو برا کہکر جیل جا رہے ہیں تو وہ بھی اپنے آپ کو مجاہد کہتے ہیں، اس لئے اگر معاملہ انسانوں کا ہوتا تو کچھ امید صلح کی ہو سکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ یہ معاملہ مجاہدین کا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا حشر کیا ہوگا۔ اس نزاع سے جو خلیج نہ صرف لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان کے شیعہ سنیوں کے درمیان حایل ہو گئی ہے، وہ اب صلح کے بعد بھی ۵۰ سال تک دور نہیں ہو سکتی اور اس سے زیادہ بدنصیبی مسلمانوں کی اور کیا ہو سکتی ہو کہ ٹھیک اس وقت جبکہ دوسری قومیں اپنے اور ملک کے مستقبل کی فکر میں لگی ہوئی ہیں، مسلمان صدیوں قبل کے اس جھگڑے کو لیکر بیٹھے ہیں جو اگر طے ہو جائے تو بھی عاقبت بخیر ہونے کی توقع نہ شیعہ کو ہو سکتی ہے، نہ سُنی کو —— کیا اس سے زیادہ دیوانہ سری کی مثال کوئی اور مل سکتی ہے!

---

# سرزمینِ ہند کی ایک روایت حسن و عشق

## فیضی کی زندگی اور اسکی مثنوی نلدمن پر نقد و تبصرہ

فیضی کے نقوشِ حیات عہد اکبری کے ضخیم سرمایۂ ادب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ معاصر مورخوں اور تذکرہ نگاروں کے علاوہ عہد محمد شاہی کے مشاہیر (خانِ آرزو، والہ داغستانی اور آزاد بلگرامی) نے بھی فیضی کے حالات پر جامع انداز سے روشنی ڈالی ہے، معاصرین میں بعض واقعہ نگار فیضی کے مخلص دوست تھے، بعض سے رقیبانہ چشمک تھی اور بعض نے سطحی طور پر اس کا مطالعہ کیا تھا، ان میں مشہور مرزا نظام الدین احمد مولف طبقات اکبری اور عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی مولف منتخب التواریخ ہیں میرزا نظام الدین کو جس طرح فیضی سے دوستی تھی اسی طرح بدایونی کو اس سے معاندانہ غصہ تھا، بقیہ اکثر تذکرہ نگاروں نے فیضی کو سراہا ہے عرفی (متوفی سنہ ۹۹۹) اور ظہوری (متوفی سنہ ۱۰۲۵) وغیرہ سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ تقی اوحدی لکھتا ہے:-

"جمیع متاخرین حتیٰ مولانا عرفی انکارہ تیغ ہند طبع شاں از سوہان فطرت و مصاحبت او بہ اصلاح آمدہ"[1]

تقی اوحدی ایرانی الاصل ہے اور اس لئے یہ روایت کہ عرفی جیسے بلند پایہ شاعر نے فیضی سے استفادہ کیا، بہت مستند اور محکم ہے اور اس سے فیضی کے علمی و فنی کمالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ عبدالباقی نہاوندی، ظہوری کے سلسلہ میں رقمطراز ہے:-

"آمد و رفت کتابات نظم و نثر کہ میانہ ایشاں ابوالفیض فیضی شدہ در میان مستعدان زمان مشہور است خصوص کتابے کہ در آنجا چند بیت نظم در مدح شیخ فیضی درانیکہ بہ احمد نگر از جانب جلال الدین محمد اکبر بادشاہ آمدہ نوشتہ است بآں اقتضا می نماید کہ ہر گاہ چوں بہ نظر مطالعہ نکتہ داناں فطن در می آید حالت مولانا ظہوری مبرہن می گردد"

آگے چل کر لکھتا ہے کہ جب شیخ فیضی اکبر کی طرف سے احمد نگر اور بیجاپور میں "عاجب" کی حیثیت سے

---

[1] تذکرہ عرفات العاشقین

وارد ہوئے تو "در صحبت سامی یکدیگر را دریافتہ مرید و معتقد ہم شدند"[1]۔ لیکن بدایونی کے الفاظ ایک ناقد کو حیران کردیتے ہیں کہ آیا وہ فیضی کے اخلاق و کردار کے متعلق مرزا نظام الدین، خان آرزو اور آزاد بلگرامی وغیرہ کی روایات قبول کرے، یا بدایونی کی روایت کو تسلیم کرے، جس میں فیضی کا خد و خال نہایت مکروہ نظر آتا ہے اس میں شک نہیں فیضی کے متعلق بدایونی کی روایت علمی دنیا میں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھی گئی چنانچہ علامہ شبلی اور ابوالکلام آزاد جیسے نکتہ داں اور حقیقت شناس بھی اس کے بیان پر سخت چیں بجبیں نظر آتے ہیں اور اس کے افکار کو معاصرانہ رقابت کا نتیجہ بتاتے ہیں، بدایونی کی روایت سامنے رکھنے کے بعد ایک نقاد کچھ الجھن سی محسوس کرنے لگتا ہے، جہاں تک فیضی کی علمی واقفیت اور نکتہ دانی کا تعلق ہے، بدایونی کی روایت پر مرزا نظام الدین کے انکار کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن اس کے بعد جب وہ فیضی کی زندگی اور اخلاق کا جایزہ لیتا ہے تو اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھتا، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ وہی قلم جو عالمانہ کمال کی مدح سرائی کررہا تھا، اخلاق و کردار کی تحلیل کرنے میں اس قدر غضبناک کیوں ہوجاتا ہے۔ اس میں شک نہیں فیضی اثنا عشری شیعہ تھے اور بدایونی سنی، معاصرانہ رقابت بھی ہوسکتی ہے، مذہبی اختلافات اور درباری زندگی کی ریشہ دوانیاں بھی دونوں میں اختلاف کا سبب ہوسکتی ہیں لیکن بدایونی کا اسلوب بیان کچھ ایسا ہے کہ اس کو محض نتیجہ بغض و رقابت کہہ کر ٹال نہیں دیا جاسکتا ہے، اب آیئے بدایونی کی روایت کا تجزیہ کریں اور کسی خاص نتیجہ پر پہونچیں وہ کہتا ہے "در فنون فضایل و اقسام کمالات یگانہ روزگار بود و در نظم طرازی و نثر نگاری یکتائے زماں،" آگے چلکر لکھتا ہے "در فنون شعر و معمہ و عروض و قافیہ، و تاریخ و لغت و طب و خط و انشا عدیل در روزگار نداشت" اس سے پتہ چلتا ہے کہ بدایونی فیضی کی علمی اہلیت و ہمہ دانی کا نہ صرف قایل تھا بلکہ اس بات میں اس کا بڑا مداح تھا اور اس لئے یہ خیال کرنا کہ اس کے اخلاق و عادات کے متعلق اس نے معاصرانہ عناد و رقابت کی بنا پر لکھا ہے، کچھ معقول سی بات نہیں معلوم ہوتی، آگے چلکر بدایونی بڑے زنی کرتا ہے "مخترع جد و ہزل و عجب و کبر و حقد، مجموعۂ نفاق و خباثت و ریا و حب جاہ و رعونت بود،" پھر اسکے بعد نہایت بے باکی کے ساتھ وہ لکھتا ہے کہ یہ شخص اہل اسلام کے ساتھ عداوت رکھتا تھا، دین کی اصل الاصول میں طعن کرتا، صحابہ و تابعین کی مذمت کرتا، مشایخ متقدمین و معاصرین کی شان میں نازیبا کلمات کہتا، کھلم کھلا علمائے دین اور صلحا کے ساتھ بے ادبی کرتا، غائبانہ ان کی اہانت کرتا یہاں تک کہ شریعت کی بہت سی حرام چیزوں کو حلال جانتا تھا اور فرائض کو حرام سمجھتا تھا، قرآن مجید کی بے نقط تفسیر لکھا کرتا

---

[1] مآثر رحیمی

اس حال میں کہ مست اور ناپاک ہوتا، کتے اس کے اوراق پائمال کرتے رہتے، اس کے بعد بگڑ کر لکھتا ہے کہ "مدت چہل سال درست شعر گفتہ اما ہمہ نادرست گفتہ"، یہاں تک کہ اس کا دیوان اور مثنوی بیس ہزار سے زیادہ ابیات پر مشتمل ہے اور اس کی اشاعت پر اس نے اپنی جایداد کی ساری آمدنی صرف کی اور اپنے دوستوں کے پاس نزدیک اور دور دراز مقامات میں تحفۃً بھیجے لیکن "قبول خاطر نصیب اعدا" وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا کلام عشق و معرفت اور چاشنی درد سے خالی ہے[1]۔ یہ ہے بدایونی کی روایات کا خلاصہ جسپر بعض فضلا برہم نظر آتے ہیں، اور وہ فیضی کے کمالات سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بدایونی کو ساقط الاعتبار اور رقیب معاصر کہکر ٹال دیتے ہیں۔ لیکن ایک غیر جانب دار ناقد یوں سرسری طور پر گزر جانے کے لئے تیار نہیں، بدایونی کی روایت میں حقیقت کی جھلک پائی جاتی ہے گو اس میں معاصرانہ رقابت کی بے لطفیاں اور درباری زندگی کی شکر رنجیاں بھی شامل ہوں، بدایونی کی تائید خود والہ داغستانی کے ایک اہم بیان سے ہوتی ہے وہ لکھتا ہے:۔

"چوں اکبر بادشاہ در شرائع سست اعتقاد واقع شدہ بود و در بعضی امور مراعات ہنود می نمود مردم نسبت انحراف او را بہ شیخ فیضی می دہند"

آگے چلکر لکھتا ہے کہ اس بات کا مجھے یقین نہیں آتا تھا یہاں تک کہ میں نے نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم محمد شاہی ابن مرحوم عمدۃ الملک امیر خاں بہادر عالمگیر شاہی سے یہ روایت سنی وہ روایت یہ ہے:۔

"می گفت بیاضے بہ خط شیخ فیضی دیدم در آنجا نوشتہ بود کہ اینکہ مردم بہ من الحاد و کفر نسبت می دہند بدلیل اینکہ اکبر بادشاہ را از جادۂ اسلام منحرف نمودہ ام وجہش این ست کہ ہرچند خواستم کہ اکبر بادشاہ را بہ مذہب حقہ اثنا عشریہ دلالت کنم از فرط تعصب کہ در فطرتش مضمر بود صورت نہ گرفت و ملاحظہ کردم کہ بہ جہت عصبیت بہ مومنین و شیعیان امیر المومنین برسد بہذا حیلہ انگیختم و اعتقاد او را بہ مذہب اسلام سست کردم و چناں وا موزم کہ او را داعیۂ نبوت و دغدغہ رسیدن بشارات سماوی شد۔۔۔۔۔۔ ، دباین وسیلہ شرِ او را از سر شیعیان رفع کردم زیرا کہ در نزد او سنی و شیعہ مساوی شد و در مذہب ہنود ہم نگذاشتم کہ استقامت یابد کہ مبادا بہ مسلمین آفت رساند"

(تذکرہ ریاض الشعراء)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ فیضی کے کردار کے سارے نقوش جو منتخب التواریخ میں نظر آتے ہیں محض بدایونی کی نگارش قلم کا نتیجہ ہونے کے باعث غلط نہیں ہو سکتے۔

---

[1] منتخب التواریخ۔ [2] لیکن اس روایت کے صحیح ماننے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ (نیاز)

## نام و نسب ولادت و وطن

شاعر کا نام ابوالفیض، تخلص فیضی تھا، بدایونی کی روایت ہے کہ اس کے بھائی ابوالفضل کو "علامی" کا خطاب ملا اس لئے اس کے آوزان فیضی نے بھی اپنا تخلص فیاضی مقرر کیا لیکن یہ انتخاب مرنے سے صرف ایک دو ماہ قبل کیا تھا[1]۔ فیضی کے حالات زندگی کے متعلق آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان میں جو کچھ مرقوم ہے وہ قول ودل ہے، آزاد نے نہایت خوبی سے اس کی ساری زندگی تاریخ ولادت و وفات، تحصیل علم، درباری زندگی، کمالات علمیہ اور تصنیفات سے بالاختصار مگر جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ آزاد کا بیان ہے کہ فیضی سنہ ۹۵۴ھ میں پیدا ہوئے، خان آرزو کہتے ہیں کہ تقی اوحدی (مولف تذکرہ عرفات العاشقین) فیضی کا معاصر ہے لیکن بیگانہ ہے (درانحالیکہ فیضی کے حالات میں پوری پوری سطریں خان آرزو نے تقی اوحدی ہی سے نقل کر دی ہیں) اور اس کے حالات سے اچھی طرح مطلع نہیں ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"اجدادش از عرب بہ ملک ہند آمدہ توطن اختیار نمودہ اند یکے از آں در ناگور کہ سابق شہرے بود اسلامی فروکش کردہ شیخ مبارک والد شیخ مذکور در انجا پیدا شدہ[2]"

والہ داغستانی کی روایت ہے کہ شیخ فیضی از اولاد قاضی حمید الدین ناگوری ست کہ استاد خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی بودہ[3]، تاریخ فرشتہ میں قاضی حمید الدین کا تذکرہ پایا جاتا ہے[4]۔ والہ داغستانی فیضی کا مولد و موطن ناگور بتاتے ہیں جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:- "ولد بمستقر الخلافۃ اکبرآباد سنۃ اربع و خمسین و تسعمایۃ[5]" اور اس کی تائید خان آرزو کی تحریر سے بھی ہو جاتی ہے وہ فرماتے ہیں:- "مولد و منشاء وے دارالملک آگرہ است و وفاتش در لاہور و بہ آگرہ جسدش را نقل نمودہ" لیکن آگے چل کر یہ بھی فرماتے ہیں "شیخ مبارک در عہد اکبر بادشاہ ابوالفیض فیضی و ابوالفضل را کہ چند سال خردتر از فیضی است ہمراہ گرفتہ بہ دارالسلطنت رسیدہ بہ اوستادی اکبر بادشاہ سرفراز شدہ[6]"۔

خان آرزو کی دونوں روایات کی تطبیق سے کچھ اشکال پیدا ہوتا ہے، جب فیضی دارالملک آگرہ میں پیدا ہوئے تو پھر شیخ مبارک کا فیضی اور ابوالفضل کو لیکر دارالسلطنت آگرہ میں آنا کیا معنی رکھتا ہے؟ خود آزاد بلگرامی نے بھی ایسی روایت لکھی ہے جس کے سیاق و سباق سے فیضی کا آگرہ سے دور دست ہونا مستنبط ہوتا ہے، لکھتے ہیں:-

"تلمذ علی ابیہ الشیخ مبارک صاحب التفسیر المسمی بمنبع عیون المعانی" | اپنے والد شیخ مبارک صاحب تفسیر مسمی بہ منبع عیون المعانی

[1] منتخب التواریخ۔ [2] مجمع النفائس۔ [3] ملاحظہ ہو فرشتہ تذکرہ قطب الدین بختیار کاکی۔ [5] سبحۃ المرجان ص ۴۳۔ [6] مجمع النفائس۔

المعانی المتوفی سنہ احدی والف واخذ عنہ الفنون المتداولہ وحصل الفراغ من تحصیلہا وہو ابن اربعۃ عشر سنۃ وخاض کثیراً فی الحکمۃ والعربیۃ ولما وصل صیت کمالہ الی مسامع السلطان اکبر ارسل الیہ منشوراً فی طلبہ سنۃ اربع وسبعین وتسعمائۃ فذہب الی السلطان ولازمہ واختص بمزید القربۃ والمصاحبۃ ولقبہ السلطان بملک الشعراء[1]

(متوفی سنہ ۱۰۰۱ھ) سے شرف تلمذ حاصل کیا اور آپ سے فنون متداولہ پڑھ کر چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے فیضی نے زیادہ تر فلسفہ اور عربی زباندانی کی طرف توجہ کی جب کمال کی شہرت سلطان اکبر کے کانوں تک پہونچی تو اس نے سنہ ۹۷۴ھ میں ایک فرمان بھیجکر بلایا فیضی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسکی نوکری کر لی سلطان نے ان کو مزید قربت اور ہم نشینی سے مخصوص کیا اور "ملک الشعرا" کا لقب عطا فرمایا۔

اس اشکال کا حل یہ ہے کہ سنہ ۹۵۴ھ میں جس وقت فیضی آگرہ میں پیدا ہوئے اسوقت یہ دارالخلافہ نہ تھا اور نہ اکبر کا دور حکومت تھا بلکہ اکبر اسوقت چار پانچ سال کا بچہ تھا، ہمایوں شیرشاہ سے شکست کھا چکا تھا اور اسوقت حکومت دہلی سوری خاندان کے زیر نگیں تھی، سلیم شاہ سوری تخت دہلی پر حکمران تھا، اسی زمانہ میں فیضی اکبر آباد میں پیدا ہوئے، پھر تحصیل علم کے سلسلے میں والد کے ساتھ باہر چلے گئے۔ سنہ ۹۶۳ھ میں اکبر تخت پر بیٹھا اسوقت فیضی کی عمر نو سال کی تھی اور اکبر تیرہ برس کا تھا شیخ مبارک بقول خان آرزو فیضی اور ابوالفضل کو لے کر آگرہ آئے اور اکبر کے اتالیق مقرر ہوئے اس کے بعد بروایت مرزا نظام الدین "فیضی در خدمت حضرت خلیفۂ الٰہی نشو و نما کردہ[2]" سنہ ۹۷۴ھ میں جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے جبکہ فیضی کے علمی کمال کی شہرت ہوئی تو اکبر نے بلا بھیجا اور دربار میں ملازم رکھا اور ملک الشعرا کا منصب عطا کیا۔

**علمی کمال** تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ فیضی نہ صرف شاعر تھا بلکہ ریاضی وطب، فلسفہ و حکمت، ادب و تاریخ میں یدطولیٰ رکھتا تھا، اس کو عربی فارسی اور سنسکرت وغیرہ پر پورا عبور تھا اسکی تصنیفات اس کی ہمہ دانی پر دال ہیں، خان آرزو کا خیال ہے کہ "امیر خسرو کے بعد فیضی کا مثل ہندوستان کی خاک سے کوئی دوسرا آدمی نہیں اٹھا بلکہ عربی زباندانی میں خدا جانے امیر خسرو کا یہ پایہ تھا بھی یا نہیں[3]" والہ داغستانی جو فیضی سے بدگمان معلوم ہوتا ہے اعتراف کرتا ہے کہ "در سخن مسلم زماں بودہ[4]"

**تصنیفات** فیضی کی ساری تصنیفات جمع کی جائیں تو ایک دائرۃ المعارف تیار ہو جائے۔ اس نے مختلف علوم و فنون پر کتابیں لکھیں۔ اس کی تصنیفات میں نہایت عجیب و غریب کتاب

---

[1] سبحۃ المرجان۔ [2] طبقات اکبری۔ [3] مجمع النفائس۔ [4] ریاض الشعرا۔

"سواطع الالہام" ہے یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے، جس میں اس نے یہ التزام رکھا ہے کہ کوئی نقطہ دار لفظ استعمال نہ ہو، فیضی نے دو سال میں اس کو مرتب کیا، تفسیر کی حیثیت سے یہ کیا چیز ہے اس سے یہاں بحث نہیں لیکن صنائع ادبیہ کے لحاظ سے یہ گویا ایک معجزہ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو عربی زبان پر کس قدر عبور تھا، والہ داغستانی کہتا ہے کہ "شیخ فیضی نصف قرآن را بے نقط تفسیر کردہ"[1]، یعنی سواطع الالہام پورے قرآن کی تفسیر نہیں۔ محمد علی خاں ابن عزت الدولہ ہدایت اللہ خاں اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں "اوائل سال سی ونہم (اکبری) ابوالفیض فیضی برادر کلاں ابوالفضل تفسیر بے نقط گفتہ مسمی بہ سواطع الالہام کرد"[2]، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۰۰۲ھ میں سواطع الالہام لکھی گئی، یعنی وفات سے کم و بیش دو سال پہلے فیضی نے یہ کتاب مرتب کی، پوری سورۂ اخلاص اس تفسیر کی تاریخ ہے۔ خان آرزو کا بیان ہے کہ میر رفیع الدین معمائی نے یہ تاریخ کہی، آزاد بلگرامی امیر حیدر معمائی کاشانی کا نام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فیضی نے اس کو اس صلہ میں دس ہزار روپے عطا کئے۔

فیضی کی دوسری کتاب فلسفہ اخلاق ( Ethics ) پر ہے اس کا نام موارد الکلم ہے یہ بھی "سواطع الالہام" کی طرح عربی زبان میں ہے اور اس میں بھی بے نقط الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مولٰنا آزاد فرماتے ہیں " ولہ تصانیف اخری مثل موارد الکلم بالعبارۃ العربیۃ وہی رسالۃ غیر منقوطۃ فی الاخلاق"[3]

خان آرزو اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں " دراں کتاب داد فصاحت و بلاغت دادہ و خاتمۂ آں تمام منقوط است"[4]۔ فارسی ترجمہ لیلاوتی، اصل کتاب سنسکرت میں ہے، اس کا مصنف شہر بیدر (دکن) کا مشہور ریاضی داں "بالسکر" ہے حساب اور سیاحت (mensuration) کے متعلق یہ کتاب لکھی گئی ہے[5]۔ فیضی نے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف سنسکرت و بھاشا سے شعر و ادب کی کتابوں کو فارسی میں منتقل کرنے کی اہلیت رکھتا تھا، جیسا کہ نل و دمن، رامائن وغیرہ سے پتہ چلتا ہے۔ بلکہ وہ فلسفہ و ریاضی کے متعلق بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتا تھا، "مثنوی نل و دمن" کے متعلق سطور ذیل میں بہت بسیط تبصرہ کیا جا رہا ہے، رامائن کا فارسی ترجمہ بھی اہل نظر کے سامنے ہے اس کا ایک قلمی نسخہ میرے ایک ہندو دوست کے پاس ہے۔ اس ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھاشا کے مباحث کا خلاصہ ترجمہ کرنے میں کس قدر مہارت رکھتا تھا، "بھاگوت گیتا" کا فارسی ترجمہ عام طور پر ملتا ہے، اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سنسکرت سے فلسفیانہ نکات کو کس سہل اور شگفتہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ "موسیقی پر بھی اسکی

[1] ریاض الشعرا۔ [2] بحر المواج۔ [3] سبحۃ المرجان۔ [4] مجمع النفائس۔ [5] سبحۃ المرجان۔

ایک کتاب ہے اس میں اس نے ہندی موسیقی پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے۔ (اس کا ایک قلمی نسخہ حضرت تمنا پھلواروی کے کتب خانہ میں ہے)

شعر و ادب کے سلسلہ میں فیضی نے کافی ذخیرہ چھوڑا ہر صنعت پر اس کا کلام پایا جاتا ہے تقی اوحدی لکھتا ہے :- "کلیات وے از قصاید و تغزلات و مثنویات چہ نل و دمن و چہ مرکز ادوار وغیرہ تخمیناً قریب بست ہزار بیت متداول است"[1]

بدایونی بھی کلام کی تعداد کے متعلق لکھتے ہیں "دیوان و مثنوی او از بست ہزار بیت زیادہ است"[2] خان آرزو نے بھی تقریباً یہی تعداد لکھی ہے[3]۔ مرزا نظام الدین کا بیان ہے کہ فیضی کے صرف دیوان میں پندرہ ہزار سے زیادہ شعر ہیں[4]۔ اکبر نامہ اور مرکز ادوار فیضی کی دو مثنویاں ہیں۔ خان آرزو کی رائے ہے کہ یہ دونوں مثنویاں "نل و دمن" سے زیادہ اہم اور پختہ کارانہ ہیں۔ "نل و دمن" کے متعلق انھوں نے جو تنقید کی ہے اس پر آیندہ سطور میں روشنی ڈالی جائے گی۔

جنوبی کنسنگٹن کے وکٹوریہ والبرٹ میوزیم نے حال ہی میں "اکبر نامہ" کے ایک حصہ کا قلمی نسخہ خریدا ہے جس میں تقریباً ایک سو دس نقوش و تصاویر ہیں، یہ نتیجہ ہیں ان مصوروں کے موئے قلم کا جن کو ابو الفضل دوسرے درجہ میں رکھتا ہے، مگر چند نقوش پر "بساون" کا بھی دستخط ثبت ہے، جو دربار اکبری کا مشہور ترین مصور تھا،[5]

"مرکز ادوار" نظامی کی مثنوی "مخزن اسرار" کے جواب میں ہے، یہ فیضی کی زندگی کے آخری ایام کی چیز ہے چونکہ خان آرزو نے اس مثنوی کا یہ شعر نقل کیا ہے :-

منکہ دریں میکدہ فیاضیم صاف و کدر ہرچہ رسد راضیم

بدایونی کی روایت اگلے سطور میں لکھی جا چکی ہے، کہ فیضی نے مرنے سے صرف چند ماہ پیشتر فیاضی تخلص اختیار کیا تھا

**وفات**

والہ داغستانی کی روایت ہے کہ فیضی کی وفات سنہ ۱۰۰۴ھ میں لاہور کے اندر ہوئی، محمد علی خاں کا بیان ہے کہ جلوس کے چالیسویں سال اکبر دکن کی تسخیر کے لئے متوجہ ہوئے، اسی زمانہ میں فیضی نے دمہ کے عارضہ سے انتقال کیا، بدایونی کہتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحہ میں اکبر عیادت کے لئے گیا تو فیضی کتوں کی طرح بھونکا، اکبر نے یہ واقعہ بر سر دیوان کہا، اس کا چہرہ ورم کر آیا تھا اور سارے ہونٹ سیاہ ہو گئے تھے، بادشاہ نے کہا کہ یہ سیاہی کیسی کیا مسّی لگائی ہے ؟ ابو الفضل نے کہا کہ نہیں بلکہ خون کا اثر ہے جو تھے سے خارج ہوتا تھا وفات پر شعرا نے ہجو یہ تاریخیں کہیں :-

فیضی بے دین مرد سال وفاتش فصیح گفت سگے از جہاں رفت بہ حال قبیح

---

[1] تذکرہ عرفات العاشقین۔ [2] منتخب التواریخ۔ [3] مجمع النفائس۔ [4] طبقات اکبری۔ [5] Indian Sculpture + Painting P. 165 by E. B. Havell

## نل ودمن

نل ودمن فیضی کی وہ مشہور مثنوی ہے جس میں سرزمین ہند کے ایک افسانہ حسن و عشق پر فارسی میں تبصرہ کیا گیا ہے اس لئے خسرو کی "قران السعدین" شمس الدین فقیر کی "پرس رام دلارام" کی طرح فیضی کی اس مثنوی میں بھی صہبائے ہندی جام ایرانی میں چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے کہا جاتا ہے کہ فیضی نے یہ مثنوی اکبر کی فرمایش پر لکھی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے چونکہ وہ ایرانی اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کے امتزاج سے سرزمین ہند میں ایک جدید قومیت کی بنیاد ڈالنا چاہتا تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر زمانہ داراشکوہ کا ساتھ دیتا تو آج ہندوستان میں جو فرقہ وارانہ کشاکش کا جولانگاہ بنا ہوا ہے، ایک مشترک ہندوستانی قومیت کی روح کارفرما ہوتی، بہرحال فیضی نے اکبر کے مشن کو اپنی علمی و ادبی لیاقت سے بڑی حد تک کامیاب کیا۔ بعض اساتذہ کا خیال ہے کہ نل ودمن چونکہ فیضی نے جلدی میں کہی اس لئے اس کے اندر وہ پختہ کاری اور فنی خصوصیت نہیں پائی جاتی جو اس کی دوسری مثنویوں "اکبر نامہ" اور "مرکز ادوار" میں پائی جاتی ہے، خان آرزو اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اکبر کی فرمایش پر فیضی نے یہ مثنوی لکھی ہے، اس لئے اس کو جلد ختم کرنا چاہتا تھا، مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے اندر کونسی فنی خامیاں ہیں صرف اتنا لکھ کر ختم کر دیتے ہیں۔

"چوں قصہ نل ودمن در اصل ہندی بود و شیخ مراعات ربط فارسی و ہندی می خواست و نیز بسبب فرمایش بادشاہ ارادہ داشت کہ زود تر گوید چنداں خوب نگفتہ و بر کسے کہ ماہر فن باشد بعد مطالعہ ایں معنی بہ وضوح می پیوندد۔" [1]

پوری مثنوی پڑھ جائیے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ خان آرزو کی رائے کہاں تک صحیح ہے، نہ مراعات ربط فارسی و ہندی" سے بجز اس کے کہ فارسی زبان میں ہے اور نہ کہیں سے "زود گوئی" ثابت ہوتی ہے، بلکہ پوری مثنوی میں ہندی شاعری کے تخیلات اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کے آثار جاری و ساری ہیں، "زود گوئی" کے بجائے بعض مقامات میں بیجا "طول گوئی" پائی جاتی ہے، اور اس وجہ سے اصل قصہ کا تسلسل و ربط قائم نہیں رہتا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیضی نے یہ مثنوی جلدی میں نہیں کہی ہے بلکہ اطمینان اور سکون کے ساتھ اس کو شروع سے آخر تک لکھا ہے۔

نل ودمن کو عہد مغلیہ میں ایک خاص رتبہ حاصل تھا، چنانچہ ای بی ہیول لکھتا ہے کہ چنگیز نامہ، ظفر نامہ (تیمور) رزم نامہ، رامائن، کلیلہ و دمنہ، عیار دانش کی طرح نل ودمن کو بھی تصاویر و نقوش سے مزین کیا جاتا تھا۔

---

[1] مجمع النفائس -

فیضی کی اس مثنوی کا وزن "مزاحفات ہزج اخرب مقبوض محذوف مسدس" سے ہے، اور اس کی بحر ہے "مفعول مفاعلن فعلن" اسی وزن و بحر میں حسین واعظ خاقانی، خسرو اور جامی وغیرہ نے بھی مثنویاں لکھیں جس کی تفصیل مجمع الصنایع میں درج ہے[1]

## یورپ میں مثنوی نل و دمن کی پذیرائی

فرینز باپ (جو اگسٹ ولہم وان شلیگل کا معاصر تھا جس نے "گیتا" کا نسخہ مع لاطینی ترجمہ شایع کیا) ۱۷۹۱ء میں پیدا ہوا ۱۸۱۲ء میں پیرس گیا، وہیں اس نے شلیگل کے ساتھ ملکر السنہ مشرقیہ کی تحصیل کی اور "چیزی" سے سنسکرت پڑھی، شلیگل اور اس کے بھائی رومانی شعرا تھے، ان کا میلان ہندوستانی ادبیات کی طرف ہو گیا فرینز باپ نے سنجیدہ تحقیق شروع کی، چنانچہ یہ شخص ایک جدید سائنس "لسانیات تقابلی" کا بانی بن گیا، اور یہ اعزاز اس کو اسوقت ملا جب اس فن پہ اس کی تالیف ۱۸۱۶ء میں شایع ہوئی، باپ نے ہندوستانی ادبیات کی دنیا میں بھی گراں قدر خدمتیں انجام دیں، اس نے رامائن اور مہابھارت کے بعض قصص کا اسی بحر و وزن میں ترجمہ کیا، یہی پہلا شخص ہے جس نے مہابھارت کے قصہ نل و دمینتی کا ایک تنقیدی نسخہ مرتب کیا اور اس کے ساتھ اس کا لاطینی ترجمہ شایع کیا اس کی اس ترتیب و ترجمہ کے سبب یہ کتاب ساری دنیا کی دسترس تک آگئی، یہ مہابھارت کے بے شمار قصوں میں سے ایک قصہ ہے جو بذات خود ایک مکمل افسانہ ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ قصہ ایک عظیم الشان مثنوی کا بہترین حصہ ہے۔ بلکہ ہندوستان کے فن شعری کی خوشنما ترین تخلیق ہے۔ یہ قصہ ہندوستانی ادبیات اور سنسکرت زبان کی تحصیل کا ولولہ پیدا کرنے کے لئے بڑی خصوصیت رکھتا ہے، تقریباً تمام مغربی جامعات علمیہ میں، جہاں سنسکرت سکھائی جاتی ہے یہ بات روایتی بن چکی ہے کہ ارباب حل و عقد ابتدائی تعلیم کے لئے قصہ نل و دمن کا انتخاب کرتے ہیں، ایک بڑی وجہ بھی ہے کہ اس کی زبان میں سلاست ہے[2]۔

۱۸۱۹ء میں فرینز باپ (Franz Bapp) کا یہ تنقیدی نسخہ لاطینی ترجمہ کے ساتھ شایع ہوا تو شلیگل نے ان الفاظ میں اس کی پذیرائی کی، میں صرف یہ کہوں گا کہ میری رائے میں رقت بیان اور گداز فکر کے اعتبار سے اس نظم سے بڑھکر کوئی دوسری نظم نہیں ہو سکتی اس کے اندر اہتزازی قدرت اور تہیجی لطافت (Tenderness of Sentiments) ہے یہ نظم برنا و پیر امرا و غربا سب کے لئے یکساں دلکش ہے۔ دمینتی کا حوصلہ آزما استقلال اور اس کی نیایش اسی طرح کی ہے جس طرح ہمارے یہاں "پینیلوپ" کے متعلق مشہور ہے، یورپ میں فرینز باپ کے اس کارنامہ کو بڑی فوقیت و شہرت نصیب

---

[1] مجمع الصنایع - ۱۳۰ ۔

[2] History of Indian Literature P. 16 by Winternity Vol: I.

ہوئی، چنانچہ ۱۸۲۸ء میں جرمن شاعر فریڈ ریک روئیرٹ (Fredrich Ruckert) نے اس کا جرمن نظم میں ترجمہ کر ڈالا۔ اس کے بعد اس قصہ کو جرمنی میں اتنی ہی شہرت ہوئی جتنی انگلستان میں ڈین ایچ ایچ ملمین کا ترجمہ نل و دمینتی مشہور ہے، جو انگریزی نظم میں ہے، ملمین کا یہ انگریزی ترجمہ ۱۸۳۵ء میں آکسفورڈ سے شایع ہوا، ہندوستانی شاعری میں کوئی ایسی نظم نظر نہیں آتی جو نل و دمن کی طرح یورپی مذاق کے بالکل مطابق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً یورپ کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسے ہولز مین نے جرمن، انگریزی، فرنچ، اطالوی، سویڈش، زچ، روسی، یونانی (جدید) اور ہینگرین تراجم کا تذکرہ کیا ہے، ان کے علاوہ ونٹرنز چند دوسرے انگریزی، جرمن اور فرنچ ترجموں کا تذکرہ کرتے ہیں، ۱۸۶۰ء میں مونیئر ولیم ۱۸۶۴ء میں چارلس بروس اور ۱۸۸۵ء میں اڈون ارنلڈ نے انگریزی میں اس کے ترجمے شایع کئے، ای لابیڈینز (Labedanz) نے ۱۸۶۳ء میں ایچ سی کلنر نے ۱۹۱۴ء میں جرمن زبان میں اسکے ترجمے شایع کئے، ۱۹۲۰ء میں ایس لیوی (Levi) کا فرنچ ترجمہ پیرس سے شایع ہوا۔ نل و دمن کا متن فرہنگ و حواشی سنسکرت زبان میں بمبئی، لندن اور لیپزگ (جرمنی) سے ۱۸۶۷ء، ۱۸۷۹ء اور ۱۸۵۵ء میں علی الترتیب شایع ہوا، زمانہ دراز سے گویا یہ دستور ہو گیا ہے کہ مغربی جامعات (یونیورسٹی) میں سنسکرت زبان کی تعلیم کا آغاز ہی اس نظم سے کیا جاتا ہے، اے ڈی گوبرنٹیس (Gubernetis) نے اس کی ایک تمثیل مرتب کی اور یہ ڈرامہ ۱۸۶۹ء میں بمقام فلارنس اسٹیج پر دکھایا گیا۔

ونٹرنز نے قصہ نل و دمن کے متعلق جو رائے لکھی ہے وہ تحقیق و اکتشاف کی حیثیت سے بہت اہم ہے وہ لکھتا ہے "یہ نظم غالباً مہابھارت کے قدیم حصوں میں سے ہے، گو قدیم ترین حصوں میں یہ شمول نہیں ہو سکتا بہر حال یہ پوران قسم کے نقوش سے مبرا ہے۔

اس میں وید کے قدیم دیوتاؤں، ورونہ اور اندر کا تذکرہ ہے، وشنو اور شیو کا پتہ نہیں اس کے علاوہ تمام قدیم شاعری کے اندر معاملات عشقیہ کے سلسلہ میں ایسی نازک خیالی اور رومانیت مشکل ہی سے نظر آسکتی ہے۔ صرف پرورواس اور (Puruvavas) اُرداسی (Ulrvasi) کے معاشقہ کی قدیم نظم ہمارے اندر یہ شبہ پیدا کرتی ہے کہ قدیم ترین زمانہ میں ہندوستان عشقیہ رومان سے ناآشنا نہ تھا۔

اسے ہولز مین نے بہت سے ان شعرائے متاخرین کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے اس نظم کی تقلید میں سنسکرت اور جدید ہندوستانی زبانوں اور محاوروں میں نظمیں لکھیں[1]۔

(باقی)

عبدالمالک آروی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جرمن مستشرق ونٹرنز کی کتاب "تاریخ ادبیات ہند" ص ۲۸۱ - ۲۸۴

# ایک دن مسولینی کے ساتھ

قصر ٹورلونیا کے دروازہ سے جو اونچی اونچی دیواروں سے محصور ہے، ایک چمکدار سیاہ رنگ کا بند موٹر باہر نکلتا ہے، جس کے شیشے چڑھے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے شیشے کہ اندر کا آدمی ان سے نظر نہیں آتا اور باہر کی ہر چیز اندر بیٹھنے والوں کو وہاں سے دکھائی دیتی ہے۔ موٹر کی آواز سنکر دو سنتری کھٹاکے کے ساتھ ایڑی سے ایڑی ملاکر بندوق اپنے سینے کے آگے تان دیتے ہیں اور اس طرح سلامی لیتا ہوا یہ موٹر پھاٹک سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے اندر مسولینی تھا جو اسوقت دنیا کا نہایت ہی مشغول و محنتی انسان سمجھا جاتا ہے۔

یہ موٹر باہر نکل کر، سڑکوں پر دوسری موٹروں میں گم ہو جاتا ہے اور راستہ میں کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ مسولینی کہاں کس موٹر میں جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ قصر پلازو وینیزیا کے پھاٹک میں داخل ہوتا ہے اور سنتریوں کی سلامی لیتا ہوا اس دفتر کے دروازے پر پہونچ جاتا ہے، جہاں بیٹھ کر یہ اطالوی ڈکٹیٹر روما کی کھوئی ہوئی سطوت و جبروت واپس لانے کی فکر میں غرق رہتا ہے۔

یہ روز کا معمول ہے اور اس میں کبھی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن پہونچنے کا ٹھیک وقت یا آمد و رفت کا راستہ البتہ سوائے ڈرائور اور خفیہ پولیس کے کسی اور کو معلوم نہیں ہوتا، تاہم آٹھ اور نو کے درمیان صبح کے وقت مسولینی کا اپنے دفتر میں پہونچ جانا ضروری ہے۔

دفتر پہونچتے ہی وہ کام میں مشغول ہو جاتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اسوقت دنیا کے ڈکٹیٹروں میں اُس سے زیادہ محنتی کوئی نہیں ہے، وہ ہٹلر اور اسٹالین کی طرح اپنے ماتحتوں پر زیادہ اعتماد نہیں کرتا بلکہ خود تمام شعبوں کے کاغذات دیکھتا ہے اور ہر معاملہ کو براہ راست سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دفتر کے اوقات میں لوگوں سے ملتا بھی ہے۔ جن کا اوسط روزانہ پچاس سے کم نہیں ہوتا، دفتر سے ملا ہوا ایک پرائویٹ کمرہ ہے جس میں متعدد قسم کے یونیفارم اور سوٹ محفوظ رہتے ہیں اور موقعہ کے لحاظ سے جس ملبوس کی ضرورت ہوتی اسی کو پہنکر وہ لوگوں سے ملتا ہے۔ جنگ حبش کے بعد سے وہ زیادہ تر فوجی لباس میں رہتا ہے۔ جن لوگوں سے ملتا ہے انکے اوقات پہلے سے مقرر ہو جاتے ہیں اور ایک

منٹ کا فرق بھی ان میں نہیں ہوتا، اس کے ذاتی معاملات اس کا ہوس ہولڈ سکریٹری طے کرتا ہے جو بڑی حد تک اس کے مشابہ ہے۔

ایک بجے کے قریب وہ لنچ کے لئے جاتا ہے اور ایک گھنٹہ قیلولہ کرنے کے بعد جو تمام اطالیوں کا معمول ہے، وہ پھر سہ پہر کو دفتر چلا جاتا ہے، یا پبلک جلسوں میں شریک ہوتا ہے، بعض اوقات وہ رات کو ۸ بجے دفتر سے واپس آتا ہے۔

گرمیوں میں وہ صبح ۶ بجے بیدار ہوتا ہے اور جاڑوں میں ۷ بجے۔ ناشتہ وہیں خوابگاہ میں آجاتا ہے جس میں سوائے قہوہ اور توس کے کچھ نہیں ہوتا۔ گرمیوں میں حدودِ قصر کے اندر ہی صبح کو گھوڑے پر بیٹھکر چکر لگاتا ہے اور اس کے بعد دفتر جاتا ہے۔ ٹٹیاں اور خندق پھندانے کا اسے بڑا شوق ہے۔ جاڑوں میں صبح کو وہ شمشیر زنی کی مشق کرتا ہے جس میں اسے بڑی مہارت حاصل ہے

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ اخبارات دیکھتا ہے، اور سیاسیات کے رُخ کا مطالعہ کرتا ہے، جرمنی و فرانسیسی زبان میں نہایت آزادی سے گفتگو کرسکتا ہے اور انگریزی بھی خاصی جانتا ہے۔ سہ پہر کو ایک گھنٹہ روز اپنے ذاتی کتب خانہ میں سائنس معاشیات، تاریخ وغیرہ کا مطالعہ کرتا ہے، لیکن آرٹ کی طرف اسے زیادہ رجحان ہے۔

اس کی غذا بہت کم اور معمولی ہوتی ہے۔ وہ وھسکی یا برانڈی کبھی نہیں پیتا، لیکن دعوتوں میں کبھی کبھی ہلکی قسم کی شراب مجبوراً پی لیتا ہے۔ گوشت بہت کم استعمال کرتا ہے اور پھل بہت زیادہ، تیرنا، موٹر اور ہوائی جہاز چلانا، یا کبھی کبھی رقص اس کے خاص مشاغل تفریح ہیں۔ جاڑوں میں برف پر پھسلنا بھی اسے بہت پسند ہے۔

اس کی خانگی زندگی میں مشرق کا انداز بڑی حد تک پایا جاتا ہے، وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ پبلک جلسوں میں جانا پسند نہیں کرتا اور نہ یہ چاہتا ہے کہ وہ سوسائٹی کی چیز ہوکر رہجائیں۔ وہ اپنی گھریلو زندگی سے گھر کے اندر ہی لطف اُٹھانا زیادہ اچھا سمجھتا ہے۔

کبھی کبھی وہ شمالی اطالیہ کے اس گاؤں میں بھی چلا جاتا ہے جہاں وہ پیدا ہوا تھا، یہاں کے لوگوں سے وہ اسی عہد طفلی و شباب کی بے تکلفی سے ملتا ہے جب بنیٹو کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا تھا لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنی آمرانہ حیثیت کو اس سے متاثر ہونے نہیں دیتا،

جب ۲۲ء میں اس کو آمرانہ اقتدار حاصل ہوا تو اس نے اپنے گاؤں والوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "یہاں میں وہی بنیٹو ہوں جو پہلے کبھی تھا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ روم میں پہونچکر میں وزیر اعظم ہو جاتا ہوں، اور تمہاری حیثیت میری نگاہ میں وہی ہوتی ہے جو دوسرے اطالیوں کی ہے"

**زندگی کے نشیب و فراز**

جولائی سنہ ۱۹۰۲ء کی انتیسویں تاریخ ہے اور اٹلی کے ایک اسٹیشن چیاسو پر مزدوروں کی ایک جماعت جو ماورائے کوہستان آلپس انٹیں پاٹنے کے لئے جانا چاہتی تھی ریل کا انتظار کر رہی تھی، تمام مسافر آپس میں باتیں کر رہے ہیں، مگر ان میں کا ایک نوجوان سب سے علیٰحدہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا نام بینٹو مسولینی تھا۔ یہ اٹالیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بچوں کو تعلیم دیتا تھا اور اب اس مشغلہ سے گھبرا کر تعطیل کا زمانہ کہیں باہر بسر کرنا چاہتا تھا۔ اس کی عمر ۱۹ سال کی تھی اور جیب میں صرف ۲۰ لیرے تھے وقت کاٹنے کے لئے اس نے اخبار خریدا اور سب سے پہلے اس کی نگاہ سے یہ خبر گزری، کہ اس کا باپ جو لوہاری کا پیشہ کرتا تھا کسی اجتماعی تحریک کے سلسلہ میں گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ پڑھ کر وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ آیا اسے فوراً اپنی ماں کے پاس پہونچکر اس کی تسلی کرنا چاہئے یا اپنے سفر کو جاری رکھنا چاہئے۔ اس نے خیال کیا کہ گھر جانا بیکار ہے اور سوئٹزرلینڈ جانے کی ٹھان لی۔

بارہ گھنٹے کے بعد ٹرین اسرن پہونچی جہاں ہزاروں اطالوی مزدور تعمیر کے کام میں مصروف تھے۔ اس نے سوچا کہ جب تک کوئی اور صورت پیدا نہ ہو کیوں نہ مزدوری کی جائے۔ چنانچہ ایک ٹھیکہ دار کے پاس گیا اور اس نے تسلے میں گارا لینے کی خدمت پر مامور کر دیا۔ اس کو مکان کی دوسری منزل پر سیڑھی کے ذریعہ سے مسالہ پہونچانا پڑتا تھا، چنانچہ پہلے ہی دن اس کو ۱۲۰ چکر اوپر نیچے کے کرنے پڑے اور رات کو زمین پر خستہ ہو کر پڑ رہا۔ ایک ہفتہ تک کام کرنے کے بعد اس نے یہ کام چھوڑ دیا اور گلیوں میں نکل پڑا۔ اسوقت اس کی حالت یہ تھی کہ جیب میں صرف ۲۰ فرانک تھے اور جوتے کا تلا غائب تھا۔ اس نے بازار میں ایک جوتا خریدا اور لاسین پہونچا، یہاں بھی وہ آوارہ و پریشان پھرتا رہا۔ ایک رات وہ اسی آوارہ گردی کے سبب سے گرفتار بھی ہوا لیکن بعد کو چھوڑ دیا گیا۔ اب اس کے پاس صرف ایک نکل کا سکہ تھا اور فقر و فاقہ کی انتہائی تکالیف میں مبتلا تھا کہ امید کی شعاعیں طلوع ہونے لگیں۔

سوئٹزرلینڈ میں اطالوی سوشلسٹ جماعت کا ایک اخبار تھا جو لاسین سے شایع ہوتا تھا، کچھ عرصہ ہوا مسولینی نے وہاں ایک آرٹیکل بھیجا تھا وہ شایع ہو گیا اور مزید مقالات کی فرمایش کی گئی۔ جب یہ بھی شایع ہو گیا اور مزید مقالات کی فرمایش کی گئی۔ جب یہ بھی شایع ہوئے تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ نوجوان مقالہ نگار کون ہے۔ آخر کار اس طرح انیس سال کی عمر میں مسولینی نے اطالوی سوشلسٹ جماعت اور اطالوی مزدوروں کی یونین میں خاصی اہمیت حاصل کر لی اور جب ۲۴ اگست سنہ ۱۹۰۲ء کو اس نے اپنی سب سے پہلی تقریر کی تو وہ انجمن کا سکریٹری مقرر ہو گیا۔ اس کے بعد مسولینی کا تعارف لاسین یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے ہو گیا جس کا نام ولفریڈو پریٹو تھا، یہ سیاست مدن کا استاد تھا

اور اس کی صحبت نے مسولینی کے انقلابی خیالات کو بڑی تقویت پہونچائی۔ پریٹو نے بھی اپنی جگہ سمجھ لیا تھا کہ مسولینی میں کتنی زبردست اہلیت ترقی کی موجود ہے چنانچہ اس نے اطالوی سوشلسٹ یونین کے پریسیڈنٹ کو لکھا کہ "اپنے دوستوں سے کہدو کہ اس نوجوان رفیق (مسولینی) پر فخر کرنا چاہئے۔ یہ شخص اپنے دماغ میں کچھ ایسی خصوصیات رکھتا ہے کہ اس کا آئندہ ترقی کرنا بالکل یقینی ہے"۔

مسولینی اب اپنا وقت زیادہ تر اس قہوہ خانہ میں بسر کرتا تھا جہاں اطالیہ کے مزدور، معمار اور طلبہ جمع ہوتے تھے اور سوشلسٹ تحریک پر گفتگو کیا کرتے تھے رفتہ رفتہ جب اس جماعت نے زیادہ زور پکڑا تو مسولینی کی عزت اور زیادہ ہونے لگی کیونکہ اس جماعت میں سب سے بڑا مقرر یہی تھا۔ اس نے ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۰۳ء کو اپنی تقریر میں یونین کو آمادہ کیا کہ سرمایہ داری کا مقابلہ اب کھلم کھلا کرنا چاہئے اور جب تک کامیابی نہ ہو جائے اس کو جاری رکھنا چاہئے۔ ۳۰ مئی کو پولیس ریگولیشن کے خلاف ہڑتالیوں کا ایک جلوس نکالا اور گرفتار ہو گیا۔ ۲۷ جون کو رہا کر دیا گیا اور صوبہ برن کی حدود سے باہر کر دیا گیا۔ فیڈرل قانون کے مطابق جب غیر ملکی لوگ کسی ایک صوبہ سے نکالے جاتے تھے تو وہ اس جگہ پہونچا دئے جاتے تھے جو ان کے ملک سے قریب تر ہوتا تھا۔ اس لئے مسولینی بمقام چیاسو بھیجا گیا جہاں سے وہ ایک سال قبل امیدوں بھرا ہوا دل لیکر روانہ ہوا تھا۔ یہاں سے وہ لوگانو گیا اور پروپاگنڈا شروع کیا۔ یہاں سے وہ پھر لاسین واپس آیا اور اپنے مزدور دوستوں کے ساتھ شریک ہو کر کام کرنے لگا۔ اب وہ پہلا مسولینی نہیں رہا تھا بلکہ اپنی تقریروں کی وجہ سے خاص عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن تقریروں سے روٹی نہ ملتی تھی اس لئے اس نے پہلے ایک قصاب کے یہاں ملازمت کی اور پھر ایک میفروش کی دوکان، لیکن بعد کو یہ سب چھوڑ چھاڑ کر تبلیغی دورہ پر روانہ ہو گیا اور مختلف مقامات پر جا کر تقریریں کیں۔ اسی دوران میں معلوم ہوا کہ اسکی ماں سخت بیمار ہے اس لئے وہ اپنے گاؤں پہونچا لیکن اس کی ماں اب اچھی تھی علاوہ اس کے وہاں اب جبریہ فوجی تعلیم کا قانون نافذ ہو گیا تھا جسے یہ پسند نہ کرتا تھا اس لئے اس نے فوراً سوئٹزرلینڈ واپس جانا چاہا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ واپسی کے پاسپورٹ پر اطالوی قونصل کے دستخط نہ تھے اور یہ چپ چاپ کر جانا چاہتا تھا تاہم کسی نہ کسی طرح چوری چھپے یکم مارچ سنہ ۴ء کو جنیوا پہونچا اور ۱۸ مارچ کو اس عظیم الشان مظاہرہ میں شریک ہوا جو پیرس کمیون ( Paris Commune ) کی سالانہ یادگار میں برپا ہوا تھا۔ کسقدر عجیب بات ہے کہ ہال کے ایک گوشہ میں بینٹو مسولینی تقریر کر رہا تھا اور دوسرے گوشہ میں والڈمیر اولیانو (لینن) اور انھیں دونوں نے بعد کو تاریخ کا رُخ بدلکر رکھدیا۔

اس کے دوسرے دن اطالوی سوشلسٹ یونین کے نمائندہ کی حیثیت سے یہ زیورچ گیا اور

جب وہاں سے جنیوا واپس آیا تو اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا کہ وہ بغیر پاسپورٹ کے سوئٹزرلینڈ کی حدود میں داخل ہوا تھا۔ لیکن بعد کو وہ چھوڑ دیا گیا اور لاسین میں چھ مہینے رہنے کی اجازت اس شرط پر دیگئی کہ وہ اس دوران میں کوئی جلسہ منعقد نہ کرے گا۔ اگست میں یونین نے اسے پھر تبلیغی دورہ کے لئے باہر بھیجدیا۔ لیکن اسی دوران میں اس کی ماں کے خطوط آرہے تھے اور وہ اصرار کر رہی تھی کہ اٹلی آکر فوج میں داخل ہو جائے۔ چونکہ اس کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی اس لئے وہ اٹلی واپس گیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا۔ یہاں سے اس کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس نے اسے اٹلی کا ڈکٹیٹر بنا دیا اور اس کے اشتراکی خیالات نے وہ رخ اختیار کیا جسے فاسزم کہتے ہیں۔

---

# جنوری سنہ ۴۰ء کا نگار

## نظیر اکبرآبادی نمبر ہوگا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دیجا چکی ہے۔ وہ اہل قلم جو نظیر اکبرآبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دیجاتی ہے۔

اسوقت تک حسب ذیل عنوانات تقسیم ہو چکے ہیں:۔

| | | |
|---|---|---|
| نظیر و کبیر | = | پروفیسر فراق گورکھپوری ایم۔ اے |
| نظیر اور اُردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز | = | پروفیسر مجنوں گورکھپوری ایم۔ اے |
| نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں | = | مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے |
| نظیر کا مذہبی مسلک | = | ل۔ احمد اکبرآبادی |
| نظیر کی ہندوانہ نظمیں | = | ڈاکٹر لکشمی دت صاحب |
| نظیر کے تلامذہ اور ہمعصر اساتذہ | = | جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبرآبادی |
| نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات | = | مولانا عبدالباری آسی |
| نظیر کا فلسفۂ زندگی و نظریۂ اخلاق | = | جناب مخمور اکبرآبادی بی۔ اے |

عنوانات مقرر نہیں ہیں، ہر شخص اپنے لئے علحدہ عنوان تجویز کر سکتا ہے۔ اکتوبر تک مقالات کا پہونچ جانا ضروری ہے۔

نیاز

# کانفرنس، کونسل، کمیٹیاں

میرے ایک بڑے محترم لیکن جلے ہوئے بزرگ تھے جن کی عادت تھی کہ وہ جب تک دن میں بیشمار جھوٹ نہیں بول لیتے تھے یا اتنی ہی میٹنگ نہیں کر لیتے تھے اسوقت تک نہ خود چین سے بیٹھتے تھے اور نہ دوسروں کو چین سے بیٹھنے دیتے تھے جھوٹ بولنا چاہتے تھے تو میٹنگ کرتے تھے اور میٹنگ کرنا چاہتے تھے تو جھوٹ بولتے تھے، کمیٹیاں بنانے اور بات بگاڑنے کا بڑا ذوق رکھتے تھے، اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت، ہار جیت، مار پیٹ، ہجر، مجر، شادی غمی دھوکا دھڑی، سب کچھ میٹنگ کے ذریعہ عمل میں آتا، عقل و ایمان سے زیادہ میٹنگ پر بھروسہ کرتے، سوچتے کچھ تھے کہتے کچھ تھے، لکھتے کچھ تھے، پڑھتے کچھ تھے فیصلہ کچھ ہوتا، کرتے کچھ تھے

اکبر مرحوم آپ کو یاد ہوں گے غالباً ان کا یہ شعر بھی -

کمیٹی میں چندہ دیا کیجئے　　ترقی کی سہج کیا کیجئے

اکبر کا نسبتاً فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ ہمارے ان بزرگ نے وہ زمانہ پایا تھا جب روپے پیسے کے اعتبار سے لوگ تحت اللفظ ہو چکے تھے۔ اس لئے موصوف نے اس شعر میں ترمیم کر دی تھی

کمیٹی میں غنچے دیا کیجئے　　ترقی کی سہج کیا کیجئے

جہاں تک میرا تجربہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کا نہ ہو کہ جب کسی کام کو ٹالنا یا نہ کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہ کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ منظور ہوتا ہے کہ اس کام کو اس قابل بھی نہ رکھا جائے کہ کوئی دوسرا اسے پورا کر سکے تو اس کی مٹی کسی کانفرنس میں پلید کرائی جاتی ہے۔ کمیٹی، کونسل، کمیشن جوبلی ڈے وغیرہ ایک ہی مرض کی مختلف دلچسپ علامتیں ہیں -

پرانے زمانے میں جب ریڈیو کا دور دورہ نہ تھا اس وقت امراض دور کرنے، مقدمہ جیتنے، روزی کمانے اولاد پیدا کرنے، مینھ برسانے محبوب کو قابو میں لانے، اور رقیب کو واصل جہنم کرنے کے لئے، ٹونے ٹوٹکے سے کام لیا جاتا تھا اب اس قسم کے کاموں کے لئے کونسل اور کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ عدالتیں کھول دی گئی ہیں رزولیوشن پاس کئے جاتے ہیں، جیل خانہ کے دروازے کھٹکھٹائے جاتے ہیں، شریفوں کی پگڑیاں اُچھالی

جاتی ہیں اور ریڈیو پر تقریر کی جاتی ہے۔

آپ نے تو آپ کے بزرگوں نے (اور اس سے نہ آپ کی تحسین مقصود ہے اور نہ آپ کے بزرگوں کی توہین) وہ زمانہ یقیناً دیکھا ہوگا جب بارش نہ ہونے پر دیہات کے لڑکے ننگ دھڑنگ، محض ایک لنگوٹی زیب ستر کئے در دروازہ دروازہ اُچکتے کودتے شور مچاتے کیچڑ پانی میں لوٹتے پوٹتے چیختے چلاتے تھے۔

"کال کلوٹی اجر دھوتی، کالے میگھا پانی دے"

وہ باتیں اب خواب و خیال ہو چکی ہیں۔ ان کی جگہ اب جلسوں جلوسوں، زندہ باد کے نعروں اور بہت سی اور باتوں نے لے لی ہیں جن کا تذکرہ یوں نہیں کرتا کہ

دو رہیم از سواد وطن باز چوں رہیم!

عام طور پر کسی ملک یا قوم یا ادارہ کی ترقی کا اندازہ اس کی کمیٹیوں، کونسل اور کانفرنس سے کرتے ہیں۔ لوگ ان کے مہمل ہونے کے قایل بھی ہیں لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ کمیٹی اور کانفرنس کی ممبری قوم اور ملک کے لئے مفید ہو یا نہ ہو خود ممبروں کے لئے نہایت نفع بخش ہوتی ہے۔ آپ کے کسی کمیٹی کے ممبر ہو جانے کی دیر ہے، آپ کے لڑکے بغیر کسی فیس کے تعلیم حاصل کریں گے۔ ہسپتال والے آپ کا مفت علاج کریں گے۔ سفر بلا ٹکٹ کر سکیں گے نان نفقہ، بھنگی بہشتی، نائی، دھوبی، درزی، موچی، گرہ کٹ، کوکین فروش، کن میلئے، گورکن، کفن چور، پٹواری، اڈیٹر، مسخرے سب کی مفت خدمات آپ کے لئے وقف ہوگی۔ آپ کو سوا اپنی تجہیز و تکفین کے اخراجات کے کسی اور مد میں مالی زیر باری نہ ہوگی بشرطیکہ مرد آخرت بین کی حیثیت سے آپ نے اس کا انتظام بھی اپنی زندگی ہی میں نہ کر لیا ہو!

چنانچہ یہ امر مسلم ہے کہ جو حرکتیں کسی فرد کے لئے جیلخانہ جانے کا موجب بن سکتی ہیں وہی باتیں کمیٹی یا کونسل کے ممبروں کیلئے ہر دلعزیز اور ذی اثر ہونے کا ثبوت بہم پہونچاتی ہیں۔

کمیٹی کانفرنس اور اس قسم کے دوسرے اداروں کو جمہوری نظام کی پیداوار سمجھا جاتا ہے، لیکن جمہوری نظام اسوقت تک جمہوری نظام کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ جب تک اس قوم کی روایات یا میلانات جمہوری نہ ہوں جس نے اس نظام کو اختیار کیا ہو ہمارے ملک میں کمیٹیوں یا کونسلوں کی کمی نہیں ہے اور ضابطہ کی رو سے آپ ان پر اعتراض بھی نہیں کر سکتے لیکن یہ کمیٹیاں اور کونسلیں کن افراد پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان افراد کی افتاد ذہنی کیا ہوتی ہے، یہ بھی اپنی جگہ پر جانی بوجھی ہوئی چیزیں ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ باتیں ہوتی ہیں جو جمہوری نظام کی آڑ میں شخصی جبروت یا جماعتی تنگ نظری کی ترجمان ہوں۔

لیکن اس قسم کی باتیں ہم آپ برابر دیکھتے سنتے آئے ہیں اور ریڈیو پر وہی باتیں دہرائی جو اخبارات

میں لکھی ہوں، لیڈروں کا تکیہ کلام ہوں یا کیہ والوں کی زبان پر ہوں۔ ریڈیو پر تقریر کرنے والوں کی بدنیتی اور بدمزاقی کا ثبوت ہے۔ اسی کو بدمعاملگی بھی کہتے ہیں) میں بدمعاملگی کے بجائے نمک حرامی کا لفظ استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن اس خیال سے رک گیا کہ نمک حرامی کی فہرست یونہی کیا کم طویل ہے کہ اس کو براڈکاسٹ بھی کیا جائے

بہرحال اس قسم کی باتیں ریڈیو پر تقریر کرنے والوں سے سرزد ہوتی ہوں یا نہیں، ریڈیو سٹ کا لائسنس نہ رکھنے والوں سے غالباً ضرور سرزد ہوتی ہوں گی۔ غالباً کا لفظ میں نے احتیاطاً استعمال کیا ہے۔ اس سے آپ میرے خوض کا اندازہ لگا سکتے ہیں، اور میری احتیاط کا بھی میری طرح آپ بھی عدالتوں یا بڑے آدمیوں سے ڈرتے ہوں تو غالباً، وغیرہ، ممکن اور اسی طرح کے بعض دوسرے احتیاطی الفاظ و فقروں کا ورد رکھا کیجئے۔ بعض الفاظ میں بھک سے اُڑ جانے والے مادے کی خاصیت ہوتی ہے، ان کے لئے یہ الفاظ پانی کے چھینٹے کا کام دیتے ہیں۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ جس بات کو عام طور پر نہیں کرنا مقصود ہوتا ہے اسے کسی کمیٹی کے سپرد کر دیتے ہیں، اس کا ایک پہلو اور بھی ہے یعنی کوئی بات مشتبہ ہو لیکن آپ اسے متیقن کرنا چاہتے ہوں تو اسے کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجئے وہ کام متیقن ہو جائے گا۔ کوئی بات یقینی ہو لیکن آپ اسے مشتبہ بنانا چاہتے ہوں تو کمیٹی یہ کام بھی انجام دے گی۔ آپ کسی شخص کو مجرم قرار دینا چاہتے ہوں اور کوئی سبیل اس کے مجرم قرار دینے کی نظر نہ آتی ہو تو یہ فرض کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجئے۔ کمیٹی اس کے اسلاف اور اولاد تک کو مجرم ثابت کر دیگی کمیٹی اور کونسل صلح کے زمانہ میں وہی کرتی ہیں جو اسلحہ اور بارود جنگ کے زمانہ میں کرتے ہیں۔

عدالتوں میں جو چیز فرد جرم کہلاتی ہے وہی کمیٹی یا کانفرنس میں ٹرم آف ریفرنس ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عدالت میں صفائی دینے سے آپ کے بے گناہ ثابت ہونے کا امکان ہے اور آپ بری بھی کئے جا سکتے ہیں۔ کمیٹی پالیٹیشن کی زد میں آپ کا جاں بحق ہو جانا مسلم ہے۔

مثلاً کمیٹی کونسل یا میٹنگ کی کارستانیاں ملاحظہ فرمائیے، فرض کیجئے مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ ہندوستان کی چقندر خطرہ میں ہے، سب سے پہلے یہ خبر اخبار میں شایع کی جائے گی نہایت جلی اور شعلہ ناک سرخیوں کے ساتھ دوسرے دن سے تار آنے شروع ہو جائیں گے کہ مسئلہ چقندر پر غور کرنے کے لئے فلاں فلاں مقامات پر جلسے ہوئے جس میں چقندر زندہ باد کے نعرے لگائے گئے اور باتفاق آرا یہ تجویز پاس کی گئی کہ ہندوستانی چقندر کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی جا رہی ہے اور ان کے مقابلہ میں غیر ملکی چقندر کو جو رعایتیں حاصل اور جو سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں اس سے تمام ملک کے چقندر بیزار ہیں، اگر حکومت نے چقندر کے تحفظ میں مناسب کارروائی اختیار نہیں کی تو سارے ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔

چنانچہ تجویز پاس کی گئی کہ تمام ملک میں "یوم چقندر" منایا جائے "چقندر" کا جلوس نکالا جائے لوگوں کو چاہئے کہ اس دن صرف چقندر کھائیں۔ جن کو میسر نہ آئے وہ چقندر کی صورت بنائیں۔ عورتیں بطور فیشن اور بچے بطور کھلونا استعمال کریں چقندر ریلیف فنڈ کھولا جائے، لیڈروں کو اس کے ہار پہنائے جائیں، اطبا نسخوں میں لکھیں، شعرا بطور قافیہ استعمال کریں، گویّے اس پر تان توڑیں، روشن خیال بطور آرٹ، طلبا بطور اسٹرائک وکلا بشکل نظائر، پولیس بطور چقندر چارج، مصنفین بطور اُردو ہندی یا ہندوستانی استعمال کریں اور ہر شخص اس بات کا عہد کرے کہ جب تک وہ چقندر کو آزاد نہ کرائیگا کوئی کام ایسا نہ کرے گا جو روایات چقندری کے خلاف ہو۔

اس کے بعد ہی کونسل میں یہ سوال پیش ہوتا کیا حکومت اس عام بے چینی اور ہل چل سے واقف ہے جو چقندر کی حمایت میں راس کماری سے کشمیر اور سندھ سے آسام تک پھیل چکی ہے، جواب اثبات میں ہو یا نفی میں قوم کو اپنے جذبات چقندری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کونسل کا اجلاس ملتوی کیا جائے۔ اب جن بزرگوں کے پورٹ فولیو میں چقندر ہوگا وہ فرمائیں گے، حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ کچھ سرکاری کچھ غیر سرکاری اراکین کا ایک چقندر کمیشن مقرر کر دیا جائے جو پوری تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ اس کونسل میں پیش کرے۔

چقندر کمیشن کے اراکین کی نامزدگی کا مسئلہ بعض نوعیتوں سے بڑا دلچسپ ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون کون سے ممبر ایسے ہیں جنھیں کسی اور سبب کو بھی گاجر کمیٹی یا کمیشن میں جگہ نہیں ملی ہے۔ ان کے کھپانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ کونسل میں اس قسم کے داغ منجن یا دال دلیا کا انتظام نہ ہو تو قسم قسم کے ممبروں سے عہدہ برآ ہونا حکومت کے لئے مشکل ہو جائے۔ اب کمیشن کے اراکین ان مقامات کا دورہ کریں گے جہاں چقندر کا کاروبار ہوتا ہے۔ چقندر کے اعداد فراہم کئے جائیں گے۔ چقندر خوروں، چقندر خواروں کی عمر، تعداد نمائندگی تعلیم آمدنی و خرچ، حرکات و سکنات توالد و تناسل کا جائزہ لیا جائے گا۔ غیر ملکی ماہرین چقندر کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ ہر ممبر اپنے اپنے سفر خرچ کا حساب لگائے گا اور بالآخر اس چقندر گردی کو گرمی کے زمانہ میں کسی پہاڑ پر ختم کر دیا جائے گا جہاں اس کی رپورٹ تیار کی جائے گی۔

اس رپورٹ کے شایع ہوتے ہی تمام ملک میں نئے سر سے انتشار و ہیجان برپا ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک گول میز کانفرنس قایم ہوگی۔ اس میں شریک کئے جانے کے لئے لوگ دوڑ دھوپ شروع کر دیں گے کچھ لوگ چقندر کی حمایت میں بھلے مانسوں کی عزت و عافیت کے درپے ہوں گے۔ کچھ عوام کو ایمان و دھرم کا واسطہ دلا کر اپنا جلوس نکلوائیں گے، کچھ مسجد کے سامنے باجا بجائیں گے کچھ ارتھی پر ڈھیلے پھینکیں گے کچھ خطبہ صدارت تصنیف فرمائیں گے، کچھ فاقے کریں گے، کچھ تار بھیجیں گے، کچھ انٹرویو دیں گے بقیہ ہلڑ مچائیں گے، اسٹرائک

کریں گے، جیل خانہ جائیں گے۔ ایک آدھ مر بھی جائیں گے۔ انجام یہ ہوگا کہ انھیں سے بعض گول میز کانفرنس کے ممبر بنائے جائیں گے اور بقیہ سنکھیا کھانے یا سرکاری گواہ بننے کی فکر کریں گے۔

دنیا میں جب تعلیم اور بے روزگاری عام ہوتی ہے تو آمدنی کے عجیب و غریب ذرایع بھی نکل آتے ہیں، بے روزگاری سے میری مراد معاش میسر آنا ہی نہیں ہے بلکہ اکثر معقول مشغلے کا میسر آنا بھی ہے۔ کسی زمانہ میں ہمارے یہاں کھانے پینے کی کمی نہ تھی تو لوگ پتنگ اُڑاتے تھے، بٹیر لڑاتے تھے اور دوائیں کھاتے تھے اب افواہیں اُڑاتے ہیں قومیں لڑاتے ہیں اور دعوتیں کھاتے ہیں۔ پہلے معیشت تھی، مشغلے نہ تھے۔ اب مشغلے ہیں معیشت نہیں ہے۔ پہلے رؤسا تھے جن کے مصاحب ہوتے تھے، ارباب نشاط تھے اور پکے گانے تھے، اب لیڈر ہیں جن کے مصاحب اور ارباب نشاط بھی ہیں "توضیح سے ڈرتا اور آپ سے معافی مانگتا ہوں" پکے گانے کے بجائے قومی نعرے اور خطبۂ صدارت ہیں جن میں کہیں غزل کا لوچ، قصیدہ کا زور رجز کا آہنگ، مثنوی کی روانی اور مرثیہ کا سوز و گداز ہے، تو کہیں تعصب کی بساند مشیخت کی بکواس اور حسد کی سڑاند ہے پہلے جو کچھ درباروں اور حرم سراؤں میں ہوتا تھا اب کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے، پہلے جو نصیب دشمناں تھا اب سر دوستاں ہے۔

کمیٹیاں اور کانفرنسیں بجائے خود معقول چیزیں ہیں لیکن معقول ہی چیزیں جب نامعقول سے وسیلہ بن جاتی ہیں تو شرفا کو پگڑی سنبھالنے اور بھیک مانگنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ جمہوری نظام جس کے کمیٹی کونسل کھلونے ہیں سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس میں نامعقول سے نامعقول بات کو بھی فروغ دینے کا امکان بڑھ جاتا ہے لیکن یہاں میں جمہوری اور غیر جمہوری نظام کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا اس قسم کی بحثیں یا تو اسکول کالج کے طلبا کرتے ہیں۔ مثلاً فلاں شخص نے یہ کہا ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے، میں یہ کہتا ہوں وغیرہ، آپ مانتے ہیں تو آپ کی خوش نصیبی ورنہ "زمین کسان کی آسمان نوجوان کا کمان انسان کی تیر شیطان کا۔ اور گردن آپ کی" لیڈروں کا کیا پوچھنا، ان کو ہار پہنایئے، نعرے لگایئے ووٹ دیجئے اور جو جی چاہے کہلوا لیجئے۔ یہاں سب سے انوکھی بحث کرنی ہے یعنی بات ایسی ہو جو گنوار تعلیم یافتہ، بچے نوجوان، بوڑھے خواتین، حاکم محکوم سب کے لئے یکساں مفید اور دلچسپ ہو، کمیٹی کے اراکین اور ریڈیو کے سامعین دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کون اور کس قسم کے لوگ ہوں۔ فرض کیجئے میں تو گنوار کو سمجھا رہا ہوں، نوجوان یہ سمجھیں کہ ان کی توہین ہو رہی ہے خواتین کی طرف متوجہ ہوں تو بوڑھے بگڑ کھڑے ہوں۔ بوڑھوں کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کروں تو بچے تالیاں بجانے لگیں، نوجوان سے مخاطب ہوں تو گرگری فریاد کرنے لگے۔ محکوم سے بولوں تو حاکم گرفتار کرے اور حاکم سے گفتگو کیجئے تو نور علیٰ نور کہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

کمیٹی اور کانفرنس کا مضحکہ میں نے ضرور اُڑایا ہے لیکن میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو شراب کے عیب بیان کرنے میں اس کے ہنر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ میں تو اکثر مواقع پر ہنر بیان کرتا ہوں اور عیب سے درگزر کرتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں ایک موقع شراب کا بھی ہوتا ہے اور یہ میں اس لئے کہہ دیتا ہوں کہ شراب کی دوکان بڑھ چکی ہے لیکن تہمت شراب اب بھی باقی ہے۔

اس میں شک نہیں کونسل اور کمیٹیوں میں بعض بڑی خوبیاں بھی ہیں بشرطیکہ جو بات طے پائے وہ کمیٹی اور کونسل کا بے لاگ فیصلہ ہو، نہ یہ کہ فیصلہ پہلے ہو چکا ہو۔ گواہی جرح اور بحث بعد میں ہو عام طور پر دیکھا یہی جاتا ہے کہ جو مقصد کسی خاص شخص یا جماعت کے مدنظر ہوتا ہے وہی بالآخر کمیٹی یا کمیشن کا فیصلہ ہوتا ہے یعنی عقلمند فیصلہ کرتا ہے اس کا اعلان بے وقوفوں سے کراتا ہے، میں سیاسیات یا قومیات کا نہ معلم ہوں نہ مداری لیکن سیاسی اور قومی بازیگری کے تماشے دیکھتا رہتا ہوں۔ نت نئے تماشے ہم سب سیاسی اور قومی حقوق و اختیارات کو پہچانتے تو خوب ہیں لیکن ان کا سزاوار بننے کے لئے جس محنت خلوص یا رواداری کی ضرورت ہوتی ہے اس کے متحمل نہیں ہوتے ہم "گفتم و شد" چاہتے ہیں "و کردم و شد" کی زحمتوں سے بچنا چاہتے ہیں ہم مختلف الخیال لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر نہ عقل کی باتیں کرتے ہیں اور نہ خلوص کا ثبوت دیتے ہیں۔ دوسروں کی بات سننے اور اپنی بات منوانے میں جس تحمل، جس وسعت نظر اور جس فکر و تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے ہم ان سے چھپاتے ہیں ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کمیٹی میں بیٹھ کر صحیح دلایل سے دوسروں کو قایل کر سکتے ہوں۔ ہم اپنے نقطۂ خیال کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھنے سے گھبراتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے جس محنت و اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم میں نہ ہو برا کہنے سے بھلا بننا زیادہ مشکل ہے۔ یاد رکھئے دنیا کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے اختلافات سہنے اور سلجھانے پڑیں گے۔ مجھ سے خفا نہ ہو جیئے اقبال کو دعا دیجئے جنھے کچھ سمجھ کر ہی کہا ہوگا:-

تری دعا ہے کہ ہو میری آرزو پوری　　　مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

رشید احمد صدیقی ایم-اے

---


## مطلوب ہیں

نگار جنوری سنہ ۲۷ء - نومبر سنہ ۳۲ء جنوری و اپریل تا ستمبر - نومبر و دسمبر سنہ ۳۳ء - جون سنہ ۳۵ء - مئی و اگست سنہ ۳۶ء - فروری - دسمبر سنہ ۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں۔ دفتر کو اطلاع دیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

# آرائشِ جمال

## تاریخ اور نفسیات کی روشنی میں

عورت صحیفۂ قدرت کا ایک دلکش موضوع اور کائنات کی لطافتوں کا اختصار ہے۔ عشق و محبت کی دنیا اور اس کی تمامتر رونق اُسی کی ہستئ جمیل سے وابستہ ہے۔ شاعری کے ایک بڑے حصہ کو اُسی کی نگہ حسین، نے "شراب" بنا دیا ہے۔ ادبیات کی تحریکِ شعری اُسی کی پیدا کردہ ہے۔ موسیقی میں اُسی کی لے کارفرما ہے، رقصِ خوش ہنگام اُسی کی وجہ سے "عروجِ صہبا" اور "روانئ موج" کہلاتا ہے اور مصوری و سنگتراشی اُسی کی بدولت روحِ حیات سے معمور ہیں۔ الغرض اگر تھوڑی دیر کے لئے دنیا کو اسی حسنِ کافری سے علٰحدہ کرکے دیکھا جائے تو یہ کائنات عالم یکسر ویران نظر آئے گی اور یہ کارگاہِ اُلفت و التہاب بالکل سرد و سنسان، پھر لجا جانا، شرما جانا، روٹھ جانا، اور من جانا بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ راتیں سیاہ کرنے، جاگنے اور جاگتے رہنے کا کوئی مفہوم ہی نہ رہے گا۔ مختصر یہ کہ حیاتِ انسانی نفسِ پرستش کی آمد و شد سے محروم ہو جائے گی اور زندگی صرف طویل حماقت کا نام رہ جائے گا۔

عورت آدم کا مدعائے اولین ہے اور آج بھی جبکہ دنیا ہزاروں ارتقائی منزلوں سے گزر چکی ہے، عورت ہی ہماری تمناؤں اور راحتوں کا خلاصہ ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس کی جمال آرائیوں سے معمور نہ ہو اور موجودہ زندگی کا تو کوئی مہتم بالشان عنوان ایسا نہیں مل سکتا جو اس کے پرتوِ حسن کے بغیر انجذاب و کشش رکھتا ہو۔ زمانۂ حاضرہ کی تحقیقات نے اس کی اثر آفرینیوں کو یہاں تک ثابت کر دیا ہے کہ جمادات کی جامد و سخت دنیا بھی اس کی حشر سامان رعنائیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح عالمِ نباتات کی شگفتگی و شادابی میں بھی عورت کا نرم و نازک ہاتھ بہت کچھ اضافہ کر سکتا ہے، تحقیقِ جرم کے سلسلہ میں ایک پیکرِ جمیل کا کسی مجرم سے اتنا کہہ دینا کہ "تمھیں ہماری قسم، سچ سچ بتا دو" ہزاروں

الکشافات کا باعث ہوا ہے۔ طبی دنیا میں بھی حسنِ نسائی کی دلفریبیوں نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ خصوصاً دیوانوں کے علاج میں حسین اور جوان عورتوں کی ملاطفت بہت ہی طمانیت بخش ثابت ہوئی ہے۔

تمام مخلوقات میں عورت کا حسن سب سے زیادہ جاذبیت رکھتا ہے اور وہ بجائے خود ایک مکمل چیز ہے لیکن اگر فنِ تزئین و آرائش بھی اسی آستانۂ جمال کی ناصیہ فرسائی میں شریک ہو جائے تو پھر اس کا قیامت بن جانا یقینی ہے۔ حسنِ سادہ کی شانِ اُلوہیت کے کیا کہنے ہیں لیکن وہ حُسن بھی جو مصروفِ خود آرائی ہو، اپنی خاص دلفریبیاں رکھتا ہے اور تو اور بعض اوقات وہ حسن، خود اپنی سرمستئ حُسن سے گرمِ اختلاط نظر آتا ہے۔ نرگس آج تک اسی عالمِ حیرت میں محوِ تماشا ہے!

آسکر وائلڈ نے لکھا ہے کہ "عورت جب کبھی آئینہ دیکھتی ہے تو اس کو کوئی نہ کوئی مرد بھی وہاں نظر آتا ہے" اس مختصر جملہ میں بڑا نفسیاتی رمز پوشیدہ ہے۔ حسن نمائش کا طلبگار ہے اور جلوہ کی تسلی بغیر تماشے کے نہیں ہو سکتی حُسن کا "چاہا جانا" اس کی فطری جبلتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن "چاہنے کا" معیار مختلف زمانوں میں مختلف رہا ہے ہمارے ذوق پسندیدگی کو زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف تبدیلیوں سے ہمکنار ہونا پڑا ہے اور اُس نے حسن کے تصور اور آرائشِ جمال کی نفسیات پر بھی اثر ڈالا ہے۔ آج وہ حسن جو ہمارے لئے حد درجہ جاذبِ قلب و نگاہ ہے، وہ اپنی مستقل ارتقائی تاریخ رکھتا ہے اور اس کے حال کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اس کے ماضی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ آج ہم جن گلابی رخساروں، نیلوفری لبوں، اور شوخ و شریر نگاہوں کو پسند کرتے ہیں وہ کوئی ۱۹۳۹ء کی چیز نہیں ہیں بلکہ اُن کے اندر انسان کے ماضی کی بہت سی داستانیں پنہاں ہیں۔ موجودہ لڑکی جو اپنی آرائشِ حسن کے لحاظ سے بڑی صناعانہ تکمیل کی حامل ہوتی ہے وہ در اصل صدیوں کے اُس ازدواجی انتخاب کی پیداوار ہے جو ابتدائے آفرینش سے عالمِ حیوانات میں رائج ہے۔ اس کی تمام ذہنی اور جسمانی خصوصیات اسی انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ اب سے دس ہزار برس قبل کی عورت اُس زمانہ کے لوگوں کے خیالات کی پیداوار تھی اور آج بیسویں صدی کا پیکرِ نسوانی بالکل ہمارے نظریات کے مطابق ہے۔ دوسرے الفاظ میں، یوں سمجھنا چاہئے کہ ہمارے ذوقِ پسندیدگی نے مختلف اوقات میں اُسے مختلف سانچوں میں ڈھالا ہے۔ اب ایک زمانہ سے جسمانی خوبصورتی معیارِ حسن ٹھہرا ہے اسی لئے اسمیں چار چاند لگانے کے نئے نئے طریقے وضع ہوئے ہیں اور اب تو زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ ایک پورا فن بن گیا ہے۔ اِن واقعات کی روشنی میں آرائشِ جمال کے تاریخی اور نفسیاتی پہلوؤں پر غور کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی تخلیق اور انسان کے مختلف ارتقائی دوروں سے واقفیت بہم پہنچائی جائے۔

عالمِ حیوانات کا سب سے دلچسپ تغیر ذکور و اناث کا وہ علیحدہ وجود ہے جو تقسیمِ محنت اور تخصیصِ کار

کی وجہ سے عمل میں آیا۔ اگرچہ "نر و مادہ جانور" ( Hermaphrodite ) بذات خود "زرخیزی پذیر" تھا۔ لیکن اس کے اعضا اس طرح بنے ہوئے تھے کہ دوسرے افراد سے اتصال بھی نتیجہ خیز ہو سکتا تھا۔ اس علٰحدہ اتصال سے جو اولاد پیدا ہوئی وہ زیادہ قوی اور مضبوط تھی۔ "خانہ زاد" بچے اُنکے مقابلہ پر تنازع للبقا میں نہیں ٹھہر سکے اور رفتہ رفتہ سب مر گئے۔ اس طرح اتصال جنسی جو پہلے پہلے بالکل استثنائی فعل تھا، کچھ عرصہ کے بعد قاعدہ اور اُصول میں تبدیل ہو گیا۔

فطرت حیوانی دو خاص جبلتوں کی حامل ہے۔ ایک حفظ نفس۔ دوسرے افزائشِ نسل۔ شروع شروع میں حیوان ان دونوں باتوں کی طرف غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر متوجہ رہا۔ لیکن جیسے جیسے اس کے جسم کے مختلف اعضاء اور جوارح نشو و نما حاصل کرتے گئے اور ہیئت ترقی یافتہ ہوتی گئی، اُس میں شعور نفس پیدا ہوتا گیا۔ اب اسے غذا اور جوڑے کی تلاش تھی لیکن بے سمجھے بوجھے نہیں۔ اس میں ارادہ، وقوف اور شعور شامل تھا۔ وہ اپنے جوڑے کو اسی طرح پکڑنے لگا جس طرح اپنے شکار کو حاصل کرتا تھا۔ طبقہ اناث نے اول اول بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن ذکور کی تیزی اور ہوشیاری کے آگے اس کی کچھ نہ چل سکی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ تشدد آمیز اور جارحانہ "محبت" کرنے کا قاعدہ ختم ہو گیا۔ طبقہ اناث نے مجبور ہو کر اپنی مزاحمت کم کر دی اور مدافعت کا ایک اور دلکش طریقہ وضع کیا۔ اس نے اپنی عنایتوں کی ایک قیمت مقرر کر دی اور ذکور میں رشک و رقابت کے جذبات بیدار کر دئے۔ اسی وقت سے صنف نازک نے ظاہر دارانہ طور پر شرم و حجاب بھی شروع کیا تاکہ اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکے۔ اس نے ذکور کے جذبات میں اور بھی ہیجان پیدا کر دیا۔ یہیں سے عشق کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ اصل میں حیوان کی اس خواہش کا نام ہے جو اسے ایک ضرورت کی تسکین کے سلسلہ میں محسوس ہوتی ہے اور جو رفتہ رفتہ ایک ایسے جذبۂ محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں وہ اسی ضرورت اور حاجت سے کامل طور پر بے نیاز ہو جاتا ہے۔ عشق کا اسوقت ایک افادی پہلو بھی تھا اس سے افزائش نسل میں مدد ملی۔ اس نے دو علٰحدہ جنسوں میں اشتراک اور اتحاد پیدا کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ یہ باہمی اتحاد و اتصال نہ صرف خوشگوار اور لذت بخش ہے بلکہ نوعیاتی نقطۂ نظر سے نسل کی افزایش اور بقا کے لئے ضروری بھی ہے۔

دنیا کے دور اولین میں حق کو ثابت کرنے والی چیز صرف طاقت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں سب سے قوی اور ہیکل ذکور ہی تمام بچوں کے باپ ہوتے تھے۔ کچھ زمانہ کے بعد قبائلی نظام اخلاق کا وجود عمل میں آیا۔ اب عورتیں قبائل کی ملکیت ہو گئیں اور ہر فرقہ کے افراد میں تقسیم کر دی گئیں۔ قبیلوں میں لڑائیاں ہوتی تھیں اور ان لڑائیوں میں جیتنے والا قبیلہ مغلوبین کی عورتوں کو بھی اپنے تصرف میں لاتا تھا۔ ان غیر عورتوں سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی، وہ زیادہ تندرست و توانا ہوتی تھی۔ یہی انسانی تجربہ ہے جس نے آج بہت ہی قریب کی

شادیاں تقریباً ہر طبقہ اور ہر فرقہ میں ممنوع قرار دیدی ہیں۔

شکار کے زمانہ کے بعد زراعت کا دور شروع ہوا۔ اس نے جنسوں کے تعلقات پر بھی اثر ڈالا۔ اب انسان کو شکار کے لئے سرگرداں پھرنے کی ضرورت نہ رہی۔ بلکہ وہ ایک جگہ جم کر بیٹھ گیا اور زمین کی دولت سے فایدہ اُٹھانے لگا۔ اس کی زندگی اور املاک پہلے کے بنسبت زیادہ محفوظ ہوگئی۔ ان تمام باتوں کا اُس کے اوپر ایک نفسیاتی ردعمل ہوا اور وہ دور اولین کے مقابلہ پر زیادہ کاہل اور سست ہوگیا۔ عورتیں پانی بھرتیں، کھیتوں کو سینچتیں، مرد کی تمام خدمت انجام دیتیں۔ اور وہ۔ درختوں کے سایہ میں آرام واستراحت کرتا۔ اس کا اثر ازدواجی انتخاب پر بھی پڑا۔ اب وہ عورتیں منتخب ہونے لگیں جو تندرست، مضبوط اور جفاکش ہوتی تھیں۔ اسی زمانہ میں اُن عورتوں کو جو نازک اور حسین ہوتی تھیں کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ مضبوطی اور بدصورتی پسند کی جانے لگی اور عورتوں نے بھی ان باتوں کے پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ قبولیت کا شرف حاصل کرسکیں۔

زراعتی قبایل کو بہت سے شورش پسند جنگلی گروہوں کے خلاف جنگ کرنا پڑتی تھی۔ یہ لوگ کامیابی کی صورت میں ان وحشیوں کو سکھانے اور سدھانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ وحشی بہت کارآمد ثابت ہوتے تھے اس لئے کہ ان سے تمام مشقت کا کام لیا جا سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ عورتوں سے وہ تمام کام جن میں اُنھیں بڑی محنت اور مشقت کرنا پڑتی تھی۔ ان لوگوں کے سپرد کردئے گئے اور عورتیں صرف خلوت کی زینت ہوکر رہگئیں اس کے بعد حُسن کی پرستش عام ہوگئی اور ازدواجی انتخاب بھی جسمانی خوبصورتی کے معیار پر ہونے لگا۔

اب عورت اپنی جسمانی قوت کے بجائے جسمانی حُسن بڑھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے سنگھار کے نئے نئے طریقے نکالے اور تمام فضائے شوق کو اپنی جمال آرائیوں سے رنگین وکیف کردیا۔ برسوں کی کوشش نے اب واقعی اس کو نازک اور حسین بنا دیا ہے اور ہمارے ذہنوں میں اس کا مفہوم نرمی و لطافت، برق و مقناطیس کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔

آرائش جمال کی ابتدا غالباً مردوں کی طرف سے ہوئی۔ شروع شروع میں اس نے اپنے جسم پر چربی ملی تاکہ موسم کی سختیوں اور تندو تیز ہواؤں کو برداشت کرسکے۔ پھر اس نے عورتوں کو متوجہ کرنے کے لئے اپنے جسم کو رنگا۔ بعض اوقات اس نے دشمنوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے اپنے جسم کو بدصورت بنالیا۔ یہ اس فن کی ابتدا تھی۔ عورتوں نے اپنے جسم کو خوبصورت بنانے کے انداز مرد سے ہی سیکھے اور انھیں ترقی دی۔ زراعتی زمانہ کے بعد سے اس کی تمامتر توجہ تزئین وآرائش کی طرف مبذول ہوگئی اور ہر عورت چاہے وہ غریب تھی یا امیر، حسین تھی یا معمولی شکل وصورت کی حامل، اپنے آپ کو دلکش اور جاذب نظر بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ تاریخ کے صفحات اس کوشش کے مظاہروں سے بھرے پڑے ہیں مصر کی ملکہ حُسن

نفرتتی (Nefertiti) جس کو گزرے ہوئے تین ہزار سال ہوئے سنگھار کی بڑی شوقین تھی اور اپنے ہاتھوں اور پیروں کے ناخنوں کو رنگنے میں بڑا وقت صرف کرتی تھی۔ سمیریا میں اُر کے مقام پر ایک مقبرہ کا پتہ لگا ہے جس کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ کا بنا ہوا ہے، اس میں سے ملکہ شوباد کا سامانِ آرائش برآمد ہوا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اُس زمانہ میں سنگھار کی تمام جزئیات اس قدر مکمل کس طرح تھیں! قدیم مصر میں آنکھوں کی زیبائش پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ عورتیں نیچے کے پپوٹے کو ہرا رنگتی تھیں اور اوپر کا بپوٹا، پلکیں اور بھوئیں سرمہ سے سیاہ کی جاتی تھیں۔ ناخنوں کے رنگنے کے لئے حنا استعمال میں آتی تھی اور پالش کیا ہوا پیتل آئینہ کا کام دیتا تھا اس لئے کہ چھٹی صدی عیسوی سے قبل شیشے کے آئینہ کا کہیں رواج نہیں تھا۔ مصر میں تاریخی تحقیقات کے سلسلہ میں جو کھدائیاں ہوئی ہیں، اُن کے ذریعہ بہت سے تیل، روغن، پاؤڈر، پوماد، اور غازے، دستیاب ہوئے ہیں جن میں سے کچھ کی خوشبوئیں اب تک قایم ہیں۔

ایرانی عورتوں کو خوشبوؤں کا بڑا شوق تھا۔ قدماء کے نزدیک ایرانیوں نے بہت سے عطر اور روغن ایجاد بھی کئے تھے۔ ان لوگوں کو خوشبوؤں کا اتنا شوق تھا کہ لڑائی کے وقت بھی عطر پاس رکھتے تھے۔ یونان کی عورتیں چہرہ پر سپیدہ ملتی تھیں۔ بہت سی عورتیں سیسے کے زہر سے مسموم ہو جاتی تھیں۔ لیکن باوجود اس کے یہ رسم جاری رہی۔ یہ عورتیں چہرہ پر میدہ بھی ملتی تھیں۔ جو صبح کو دودھ سے دھو دیا جاتا تھا۔ نیرو کی بیوی پاپیا (Poppaea) افزایش حسن کا بڑا شوق رکھتی تھی۔ اس کے یہاں سو کنیزیں صرف مانگ سنوارنے، چہرہ پر غازہ ملنے اور پلکیں درست کرنے پر معمور تھیں۔ پاپیا اور روم کی دوسری عورتیں دھوپ میں نہیں بیٹھتی تھیں تاکہ اُن کا رنگ تمازت آفتاب سے خراب نہ ہو جائے اور چہرہ کا وہ غازہ جو سپیدہ اور سیندور وغیرہ سے تیار کیا جاتا تھا۔ گرمی کے اثر سے محفوظ رہے۔ یہ عورتیں اپنے بالوں کو بارش میں نہیں بھگوتی تھیں۔ اس اندیشہ سے کہ کہیں اُن میں چیک نہ پیدا ہو جائے۔ چین میں بھی پُرانے زمانہ سے غازہ کا استعمال موجود ہے قدیم جاپان میں عورتیں پندرہ طریقوں سے سامنے کے بال بناتی تھیں۔ اور بارہ طریقے پیچھے کے بالوں کے لئے رائج تھے۔ مرد و عورت جہاں کہیں جاتے تھے، اُن کے ساتھ ایک آئینہ رہتا تھا۔

عصر حاضر کو ہم حسن کے مقابلہ کا دور کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ عورت کی تمامتر توجہ آرائش جمال کی طرف مبذول ہے۔ اس نے دلربائی کے انوکھے طریقے وضع کئے ہیں اور اُن کو ترقی دینے میں سائنس اور نفسیات کی پوری مدد لی ہے۔ آج وہ آرائش و زیبائش پر دنیا کی سب سے بڑی رقم خرچ کرتی ہے۔ اس کی اس جمالیاتی ترقی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ مردکی متمردانہ گرفت سے آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس نے اُس کی

ادا ہائے جانستاں کو اور بھی قاتل بنا دیا ہے اور رفتہ رفتہ اُس کی یہ ساحرادائیاں مرد کے لئے جراحتِ زندگی بنتی جارہی ہیں۔ یورپ کے ہنگامہ زارِ حسن و عریانی کے خلاف ردعمل شروع ہو چکا ہے اور بہت سے ممالک تدبیرِ منزل کے فرائض پر پھر زور دینے لگے ہیں۔ جرمنی اور اطالیہ میں یہ ردِّعمل پورے طور پر نمایاں ہے ہٹلر اور مسولینی ایسی عورتیں نہیں چاہتے جو نہ صحیح معنوں میں عورت ہیں اور نہ مرد، بلکہ ایک تیسری جنس ہیں جس کو خود مرد کے اعمال نے پیدا کیا ہے" آمرِ جرمنی کے نزدیک شادی کا مقصد "نصف انسان اور نصف بوزینہ قسم کے جانور" پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ تندرست و توانا بچے پیدا کرنا ہے" جن کو صرف ایسی ہی مائیں اپنی گودوں سے اُٹھا سکتی ہیں جو اپنے مقصدِ زندگی سے باخبر ہوں"

بہرکیف عورت صدیوں سے اپنے حسن کی تزئین و آرائش کرتی چلی آئی ہے اور اب یہ اس کی عادتِ ثانیہ ہوگئی ہے۔ برسوں سے ازدواجی انتخاب بھی خوبصورتی ہی کے معیار پر ہو رہا ہے۔ ہمیں بھی 'خوبصورت' عورتوں کی تعریف کی عادت ہوگئی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سلسلہ کب تک رہے گا۔

موجودہ زمانہ میں معاشیات نے ہماری زندگی کے گوشہ گوشہ پر اثر ڈالا ہے۔ حتیٰ کہ ادبیات اور تواریخ تک اس کے اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے ہم اس زمانہ کو معاشیاتی دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ معاشیاتی کشمکش کا لازمی نتیجہ خود غرضی ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس نے ہمارے ازدواجی نظریات پر بھی اثر ڈالا ہے اور بعض ملکوں میں بہت سی شادیاں اسی معاشیاتی اُصول پر انجام پا رہی ہیں۔ اس سے نہ صرف ہماری "ازدواجی روحانیت" کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ ہے بلکہ ہمارے جمالیاتی ذوق کے تباہ ہونے کا بھی شدید امکان ہے۔ موجودہ انسان کی فراوانیٔ عقل و ہوش سے امید ہے کہ وہ حسن کی متاعِ گراں، اور تناسب و موزونیت کو جو اس نے صدیوں کے بعد لذتِ بے اندازہ کے طور پر حاصل کی ہے، معاشیاتی تحریکات سے مغلوب و متاثر نہ ہونے دے گا۔ ورنہ پھر ہم ایسے زمانہ میں پہونچ جائیں گے جہاں "قیامت قامتاں، مژگاں درازاں" کا کوئی مفہوم نہ ہوگا بلکہ "زر و سیم کے تودے" ہمارے لئے جاذبِ نظر ہوں گے!

**خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے**

---

**فلسفۂ مذہب**

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ ر رعایتی ۱۲ ار علاوہ محصول۔

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

# چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے

## (یادگار یوم چکبست)

چکبست کا لکھنؤ سے اتنا قدیم خاندانی تعلق تھا کہ وہ ان تمام ظاہری و باطنی خصوصیات کے لحاظ سے جو ایک شخص کو کسی خاص سرزمین سے وابستہ کردیتے ہیں، بالکل لکھنؤ کے انسان تھے، لکھنؤ کے شاعر تھے اور تمام وہ لکھنوی عناصر اپنے اندر رکھتے تھے جن پر یہ قطعۂ زمین بہ لحاظ تہذیب و معاشرت یا ذہن و فراست فخر کرسکتا ہے۔

ہر چند انھوں نے تھوڑی عمر پائی، لیکن ایک خوشحال و معزز خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان کو زمانہ سے زیادہ جنگ کرنا نہیں پڑی اور اس لئے اُن کی فطری ودیعتوں کو جلد اُبھر جانے کا موقعہ ملا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی خصوصیت کے لحاظ سے ایک حد تک (Precocious) بھی رہے ہوں بہرحال یہ بات زیادہ حیرت کی نہ ہو لیکن قابل ذکر ضرور ہے کہ صرف ۴۴ سال کی عمر میں ان کو وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جو عام طور پر لوگوں کو اس عمر میں حاصل نہیں ہوتا۔

جس زمانہ میں انھوں نے ہوش سنبھالا، لکھنؤ کا میلان شاعری وہ نہ تھا جو اسوقت پایا جاتا ہے تغزل پر ہنوز ناسخ کی بڑی گرفت قایم تھی اور جن بعض شعراء نے اس سے چھٹکارا حاصل کیا بھی تو وہ داغ سے متاثر ہوئے لیکن اُس قدیم اختلاف کی وجہ سے جو لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں پایا جاتا ہے انھوں نے اپنی داد کو یہاں سے باہر جانے دیا اور امیر مینائی کو اس کا مقابل سمجھ کر صنمخانۂ عشق کی پرستش کرنے لگے اور حیرت ہے کہ جلال کی طرف اُن کی نگاہ نہ گئی جو داغ کی چوچلے والی شاعری میں بھی ایک خاص وزن رکھتا تھا۔ بہرحال چکبست کا ابتدائی زمانہ وہ تھا جب لکھنؤ میں تغزل کا رنگ ملا جلا ناسخی و امیری تھا یعنی عشق و محبت میں بھی عروض و قافیہ ایہام اور رعایت لفظی کا ہوش انھیں باقی تھا اور اس لئے یہاں کی شاعرانہ فضا میں زہر عشق اور گلزار نسیم دونوں کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ غزل کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس سے لوگ متاثر بھی تھے

اور مرعوب بھی اور وہ انیس کے مداح تھے۔ مسدس کی شکل میں یہ وہ صنف شاعری تھی جس میں انیس کا کوئی مدمقابل نہ تھا اور چونکہ اس سے بڑی حد تک لکھنؤ کا فنی ذوقِ شاعری بھی پورا ہوتا تھا اس لئے اسکی بڑی قدر تھی، یہاں تک کہ محسن کاکوروی نے اپنا مجموعۂ نعت بھی اسی زبان ولب ولہجہ میں مرتب کیا اور اگر میرا قیاس غلط نہیں تو شاید چکبست نے بھی سب سے پہلے ۹۸ء جب کہ ان کی عمر ۱۵ سال کی تھی مسدس ہی لکھا جس کا عنوان "جلوۂ صبح" ہے اور جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک انیس سے متاثر تھے چند بند ملاحظہ ہوں :-

جب رنگِ شب، آئینۂ ہستی سے ہوا دور ہنگام سحر کون و مکاں ہو گئے پر نور
تبدیل ہوئی صورتِ کوہِ شب دیجور چمکا وہ تجلی سحر سے صفتِ طور
بجلی کی طرح چرخ پہ نورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر خرمن انجم نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم مرغانِ ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
ہنگام سحر بادِ سحر چلتی تھی پیہم آرام میں سبزہ تھا تہِ چادرِ شبنم
ہر سمت بندھی نعرۂ بلبل کی ہوا تھی
غنچوں کی نسیم سحری عقدہ کشا تھی

رونق پہ دم صبح تھا مخمانۂ عالم تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سردی بھی تھی کم کم
پیمانۂ مہتاب تھا لبریز سحر دم تھا جام صبوحی کے لئے نیّر اعظم
گردوں پہ شفق کی بھی عجب جلوہ گری تھی
مینائے فلک میں مئے گلرنگ بھری تھی

آپ اگر ان بندوں کو انیس کے کسی مرثیہ میں شامل کر دیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی اور کا کلام ہے بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ چکبست کی شاعری کا آغاز ہی اس رنگ سے ہوا ورنہ عام طور پر نوجوان لوگ جب شاعری کرتے ہیں تو اسکی ابتدا غزل سے ہوتی ہے۔ اسکا سبب غالباً یہ تھا کہ چکبست فطرتاً بہت سوچنے والا دماغ لیکر آئے تھے اور ان کی احساس شاعرانہ میں فکر فلسفیانہ کا جزو زیادہ شامل تھا محبت کسی سے انھوں نے کی ہو یا نہ، لیکن محض اسکی داستان لے بیٹھنا انکے حوصلۂ سخن سے فروتر چیز تھی اور اسی لئے وہ اپنی غزل میں بھی ایکبار اس حقیقت کے اظہار سے باز نہ رہ سکے کہ :-

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

سو اس میں شک نہیں کہ انھوں نے عام لکھنوی شعراء کے مقابلہ میں نیا مسلک بھی اختیار کیا اور عروس شعر کو بھی بڑی حد تک قید سے آزاد کیا یعنی انھوں نے اپنی نظموں کا رخ بھی کام کی باتوں کی طرف پھیر دیا اور غزلوں میں بھی وہ نقوش چھوڑ گئے جو بالکل مستقبل کی چیز تھی۔

جس طرح انھوں نے منظومات میں پہلے پہل جلوۂ صبح ایسی خالص ادبی نظمیں کہیں، اسی طرح انھوں نے غزل میں بھی اول اول ایسے شعر کہے جو بڑی حد تک غیر متغزلانہ تھے مثلاً:-

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا
جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا

عاشق بھی ہوں معشوق بھی یہ طرفہ مزا ہے
دیوانہ ہوں میں جس کا وہ دیوانہ ہے میرا

لیکن جب وہ سن و قوت کو پہونچے اور سیاسی ماحول نے ان کے قوار ادبیہ کو متاثر کیا تو پھر ان کی شاعری کا داخلی و خارجی رنگ ایک ہو گیا یعنی جو تقاضائے فطرت تھا وہی ان کی زبان سے نکلنے لگا اور جس چیز کے احساس کے لئے ان کا دماغ پیدا ہوا تھا وہی ان کے قلم سے ظاہر ہونے لگا۔ یعنی اگر انھوں نے نظموں میں خاک ہند، آوازۂ قوم، نالۂ درد ایسی نظمیں کہنا شروع کیں تو ان کے تغزل میں بھی ایک مفکرانہ پختگی پیدا ہو گئی۔ چونکہ میرا موضوع اُن کے کلام کی خصوصیات پر گفتگو کرنا ہے اس لئے میں اس اجمال کو ذرا واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ان کا مجموعۂ کلام (کلام سے میری مراد صرف مجموعۂ نظم ہے) جو صبح وطن کے نام سے شایع ہوا ہے پانچ حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے دو حصوں میں سوائے تین آخری نظموں کے سب کی سب ادبیات ملی سے تعلق رکھتی ہیں یعنی ان میں کسی نہ کسی عنوان سے وطنیت کے جذبات کو اُبھارا گیا ہے یا قومی احساس کو بیدار کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں وہ نظمیں ہیں جنھیں بعض احباب و اکابر کا مرثیہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، چوتھا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے اور پانچواں حصہ ان کا ابتدائی کلام اور غالباً اُصول انتقاد کا تقاضا یہی ہو کہ ہم ان کے کلام کا مطالعہ اس آخری حصہ سے شروع کریں۔

اس حصہ میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی نظم وہ ہے جو نوجوانانِ کشمیر کے ایک سالانہ جلسہ میں اس پندرہ سال کے نوجوان کشمیری نے پڑھی تھی۔ اور اُسے حیرت ہوتی ہے کہ اس کمسنی میں ایسے جذبات کہن سال کیونکر ان کے اندر پیدا ہو سکے اور بیان کی یہ قدرت انھیں کس طرح حاصل ہوئی۔ اس مسدس کی ابتدا بالکل انیس کے رنگ میں ہوتی ہے، وہی جوش، وہی شوکت، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی روانی، پہلا بند ملاحظہ ہو!

ہاں نورِ ازل جلوۂ گفتار دکھا دے
ہاں شمع زباں مطلع انوار دکھا دے
ہاں طبع رواں قلزم ذخار دکھا دے
ہاں رنگ سخن گلشن بیخار دکھا دے
گلزار معانی کا مہکتا نظر آئے
طوطی چمنستاں میں چہکتا نظر آئے

اس کے بعد سرزمین کشمیر کی رنگینیوں کا ذکر بھی اسی انداز سے کیا ہے۔

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا　　وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کوہ پہ لالے کا لہکنا　　مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیم سحری کا

لیکن بعد کو جب قوم کی نگونساری کا بیان شروع ہوتا ہے تو اس میں حالی کا سا سوز و درد پیدا ہو جاتا ہے اور اگر ہم اس مخصوص لب و لہجہ اور وزن و سنجیدگی کو نظر انداز کر دیں جو پختگی عمر کے بعد ہی حاصل ہونے والی چیزیں ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کمسنی میں وہ اس قدر پاکیزگی کس طرح اپنے کلام میں پیدا کر سکے - یہ نظم ۹۸ء کی ہے لیکن اس کے دو سال بعد ہی جب وہ گوبند رینا ڈے کا نوحہ لکھتے ہیں تو اس کا انداز بیان کچھ اور ہوتا ہے، الفاظ کی جستجو کی بجائے مفہوم کی طرف زیادہ توجہ پائی جاتی ہے اور اسے یوں شروع کرتے ہیں :-

اے آفتاب اوج امارت کہاں ہے تو　　اے شمع بزم حسن لیاقت کہاں ہے تو
اے عندلیب باغ فصاحت کہاں ہے تو　　اے خضر شاہراہ فراست کہاں ہے تو
اے رہ نوردِ عالم بالا چگونہٗ
ما بے تو خستہ ایم تو بے ما چگونہٗ

ہر چند شوکتِ الفاظ کا اس میں بھی خیال رکھا گیا ہے لیکن بہ نسبت پہلے مسدس کے اس میں روانی زیادہ پائی جاتی ہے۔ چکبست کا کلام بہت زیادہ نہیں ہے کیونکہ شاعری ان کا وظیفہ حیات نہ تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ باوجود اس مشق گاہ گاہ کے ان کی ہر آیندہ نظم پچھلی نظم سے ترقی یافتہ ہوتی تھی اور اگر آپ سلسلۂ تاریخ کے لحاظ سے ان کی منظومات کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت آسانی سے واضح ہو جائے گی چنانچہ ۱۲ء میں ایک مسدس جو دردِ دل کے عنوان سے لکھا ہے اس کا ایک بند ملاحظہ ہو :-

اور ہوں گے جنھیں رہتا ہے مقدر کا گلہ　　اور ہوں گے جنھیں ملتا نہیں محنت کا صلہ
میں نے جو غیب کی سرکار سے مانگا وہ ملا　　جو عقیدہ تھا مرے دل کا ہلائے نہ ہلا
کیوں ڈراتے ہیں عبث گبر و مسلماں مجھ کو
کیا مٹائے گی بھلا گردش دوراں مجھ کو

آپ نے دیکھا کہ ۹۸ء کے مسدس سے ۱۹۰۲ء کا مسدس اور ان دونوں سے ۱۲ء کا مسدس کتنا نمایاں امتیاز رکھتا ہے، لیکن چکبست کی نظر اپنی پختگی کے لئے ابھی کچھ اور زمانہ چاہتی تھی احساس کی زیادہ

تلخیاں اسے درکار تھیں، چنانچہ چند سال کا زمانہ اور ختم ہوا اور جب ۱۸ء میں نالۂ یاس کے عنوان سے ایک نظم انھوں نے لکھی تو اس کا یہ رنگ تھا۔

کیا کہیں کس سے کہیں ہم آج کیا کہنے کو ہیں — آخری افسانۂ شوقِ وفا کہنے کو ہیں
جن امیدوں کی لڑکپن میں ہوئی تھی ابتدا — آج ان کی انتہا کا ماجرا کہنے کو ہیں
بے خبر اب بھی نہیں ہم قوم کے دکھ درد سے — پہلے ہمت تھی دوا کی اب دعا کہنے کو ہیں

آپ نے غور کیا ہوگا کہ اب کتنی رسا ہو گئی ہے، انداز بیان میں کتنی آورد پائی جاتی ہے، سلاست و روانی نے جذبات کے نقش کو کتنا حقیقی رنگ دیدیا ہے۔ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ بلا وساطت الفاظ براہ راست مفہوم تک پہونچ گیا ہے اور یہی ہے شاعری کا ارتقاء۔

چکبست کے کلام کا اکثر حصہ اسی طرح کی قومی و وطنی نظموں پر مشتمل ہے اور ان سے ہٹ کر جو چند نظمیں ان کی پائی جاتی ہیں وہ بھی وطنیت کی محبت اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں رامائن کا ایک سین مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے راجہ رام چندر جی کا اپنی والدہ سے رخصت ہونا دکھایا ہے۔ لیکن اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے ابتدائی زمانہ کی نظم ہے اور رنگ انیس کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ابتدا کے دو بند ملاحظہ ہوں

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام — راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتہ سا ہو گیا ہے، یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

انیس نے بھی اس قسم کے مناظر کی تصویر انھیں الفاظ میں پیش کی ہے۔

ان کے نوحے بھی مختلف زمانوں کے لکھے ہوئے ہیں اور اُن کے انداز بیان میں بھی وہی تدریجی ارتقا پایا جاتا ہے جو مسدسوں میں نظر آتا ہے۔ گنگا دھر تلک کے نوحہ کا آغاز یوں کرتے ہیں:-

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار — روشنی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار — طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بیکسی چھائی ہے تقدیر بگڑی جاتی ہے

قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

کیسا جوش ہے، کیسی خوبصورت بندش ہے، کیسے پر شوکت الفاظ ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خاص کاوش سے کام لیکر لکھا گیا ہے، لیکن جب اسکے کئی سال بعد وہ اپنے کسی عزیز کا نوحہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اس کا اختتام یوں کرتے ہیں:-

جہاں میں دیکھے ہیں ایسے بھی خوش نصیب شجر　　سدھارتے ہیں جو گلشن سے پھول کر پھل کر

نظر سے گزرے ہیں ایسے بھی نخل بار آور　　جو سوکھ جاتے ہیں فصل بہار میں اکثر

مگر بہار و خزاں تھی نہ اس شجر کے لئے

زمیں سے اس نے اُٹھایا تھا سر تبر کے لئے

ان کی غزلوں کا حصہ، نظموں کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۶ء تک اسکی کڑیاں بھی برابر ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں انکے تغزل کا جو رنگ تھا وہ نہ ناسخی تھا نہ امیری بلکہ ایک حد تک اسقدر مبہم تھا کہ ہم اسکو دیکھ کر آیندہ کے لئے کوئی حکم نہ لگا سکتے تھے، لیکن اسکے ۵ سال بعد اسنے جو رُخ اختیار کیا وہ وہی تھا جسے عزیز لکھنوی نے تکمیل کو پہونچایا مثلاً:-

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا　　اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

نہیں ہوتا ہے محتاج نمایش فیض شبنم کا　　اندھیری رات میں موتی لٹا جاتی ہے گلشن میں

لیکن اسی زمانہ میں ان کا جذبۂ وطن پرستی غزلوں میں بھی اپنا کام کرنے لگا چنانچہ لکھتے ہیں:-

ہم پوجتے ہیں باغ وطن کی بہار کو　　آنکھوں میں اپنے پھول سمجھتے ہیں خار کو

روشن دلِ ویراں ہے محبت سے وطن کی　　یا جلوۂ مہتاب ہے اُجڑے ہوئے گھر میں

اور پھر چند سال بعد ان کے تغزل میں جو پختگی پیدا ہوئی تو اس کا رنگ اور ہی کچھ تھا۔ ملاحظہ ہو:-

انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے　　ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

مزہ شباب میں ہے سر سے خوں بہانے کا　　ہوس میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں　　مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

اس میں شک نہیں کہ چکبست غزلگوئی کے لئے پیدا نہ ہوئے تھے، لیکن یہ بھی انکی ذہانت و خوش ذوقی کا کمال تھا کہ جب اس زمین کی طرف توجہ کی تو وہاں بھی آسمان کے تارے توڑ کر دکھا دئے۔ آپ انکا سارا کلام پڑھ جائیے، کسی ایک جگہ بھی کوئی رکیک جذبہ یا لفظ نظر نہ آئے گا اور یہ خصوصیت چکبست کی اس انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے جس میں انکا کوئی لکھنوی معاصر شاعر ہمسر نہ تھا وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

قدر داں کیوں مجھے تکلیف سخن دیتے ہیں

میں سخنور نہیں، شاعر نہیں، اُستاد نہیں،

لیکن یہ ان کا کذب شاعرانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ

سخنور بھی تھے، شاعر بھی تھے، اُستاد بھی تھے

# دول عالم کی بری، بحری اور میکانکی قوت[1]

**بحری قوت** گزشتہ جنگ عظیم نے یوروپین قوتوں کو یقین دلا دیا ہے کہ جب تک کوئی ملک اسلحہ سازی میں اپنے ہی ملک کی پیداوار پر بھروسہ کرنے کے قابل نہ ہو، اسوقت تک اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اب ہر ملک اسی کوشش میں مصروف ہے کہ ضروریات جنگ کے لئے ہر چیز وہ خود طیار کر سکے اور کوئی خام مواد باہر سے نہ منگانا پڑے، یہاں تک کہ اگر کوئی چیز (مثلاً ربڑ، ٹین، تانبہ، پٹرول یا نکل) کسی ملک میں نہیں پایا جاتا ہے تو ان کا بدل تلاش کیا جا رہا ہے۔

جرمنی نے اس باب میں بڑا زبردست اقدام کیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آئندہ جنگ میں اسے کوئی ایک چیز (یہاں تک کہ ربڑ اور جوٹ بھی) باہر سے طلب نہ کرنا پڑے گی اور اگر انتہائی مجبوری کی حالت میں اسے کسی چیز کی درآمد کی ضرورت پڑنے والی ہے تو وہ کثرت سے اس کا ذخیرہ ابھی سے جمع کر رہا ہے۔ جاپان جس کے یہاں ربڑ، ٹین، پٹرول اور لوہے کی پیداوار بہت کم ہے، وہ بھی ان اشیاء کے ذخیرے فراہم کر رہا ہے۔

برطانیہ کی دشواریاں اس باب میں زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ انگلستان اپنی پیداوار کے لحاظ سے بڑی حد تک دوسرے ملکوں کا محتاج ہے اور تین مہینے سے زیادہ وہ اپنی پیداوار سے اہل ملک کو زندہ نہیں رکھ سکتا۔ علاوہ کوئلہ اور لوہے کے اکثر سامان حرب کے لئے اسے باہر سے چیزیں فراہم کرنا پڑتی ہیں۔ گزشتہ جنگ میں اس نے امریکہ سے بہت سی چیزیں برآمد کیں اور اسپین و جاپان سے بھی۔ لیکن اب امریکہ کی غیر جانبدارانہ پالیسی سے یہ توقع نہیں کہ آئندہ جنگ میں کسی کی مدد کرے گا، کیونکہ گزشتہ جنگ میں وہ اپنی اس حماقت کا خمیازہ کافی بھگت چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگلستان نے گیہوں، شکر وغیرہ کا کافی ذخیرہ فراہم کر لیا ہے لیکن عرصہ تک لڑائی جاری رہنے کی صورت میں وہ بالکل ناکافی ثابت ہوگا، یہی سبب ہے کہ انگلستان جنگ سے بچنا چاہتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ جرمنی یا اٹلی سے اگر اس نے لڑائی مول لی تو صرف

---

[1] میکانکی قوت سے وہ قوت مراد ہے جو جدید آلات حرب اور مشینوں سے آراستہ ہو۔

اس کی بحری قوت اس کی ضامن نہیں ہو سکتی کہ باہر سے غلہ اور اسباب حرب بہ آسانی فراہم ہو سکے گا، کیونکہ تجارتی جہازوں کی آمد و رفت کو ہوائی جہازوں نے اب بہت خطرناک بنا دیا ہے اور اُن کی حفاظت تقریباً ناممکن ہے۔ اس خوف کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انگلستان کے مشرقی بحری راستے اب محفوظ نہیں رہے۔ بحر روم کے نقشہ کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اٹلی نے یہاں بڑا زبردست اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ طرابلس میں ایک بہت بڑے بحری مرکز کا قیام، جزیرۂ رھوڈس کی قلعہ بندیاں، جزیرۂ سسلی میں جنگی جہازوں کی موجودگی اور اسی طرح بحر روم میں واقع ہونے والے دوسرے جزایر کے فوجی استحکامات۔ ان سب نے نہ صرف انگلستان بلکہ فرانس کے لئے بھی اس مشرقی راستہ کو خطرناک بنا دیا ہے۔

بحر روم میں استحکامات جبرالٹر پر انگریزوں کو بڑا ناز تھا اور اس کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا، لیکن اب اس کے مقابل صرف ۲۵ میل کے فاصلہ سے سیوٹا میں (جو ہسپانوی مراکش کا علاقہ ہے) اتنے زبردست استحکامات جرمنی کے زیر اثر پائے جاتے ہیں کہ جبرالٹر کی اہمیت بہت ضعیف ہو گئی ہے۔ اب بحر روم سے آگے چل کر نہر سویز کو دیکھئے جہاں سے برطانوی جہاز گزر کر مشرقی مقبوضات تک پہونچتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ از روئے معاہدہ نہر سویز کا علاقہ غیر جانبدار قرار دیا گیا ہے لیکن جنگ چھڑ جانے کی حالت میں اس عہد و پیمان پر قایم رہنا محال ہے اور اٹلی یقیناً اس طرف سے جہازوں کو نہ گزرنے دے گا، یہی سبب ہے کہ برطانیہ فلسطین کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ کیونکہ اگر یہاں عربوں کی خود مختار حکومت قایم ہو گئی تو نہر سویز کا مسئلہ اس کے لئے اور زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ فرانس کا اہل شام کے مطالبات آزادی کو پورا نہ کرنا بھی اسی بنا پر ہے کیونکہ سواحلِ شام سے بھی نہر سویز کو بہ آسانی خطرناک بنایا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ اٹلی کے اثرات مشرقِ ادنیٰ میں برابر وسیع ہوتے چلے جا رہے ہیں اور یمن و جنوبی عرب پر قبضہ کر لینا مسولینی طے کر چکا ہے، اسے صرف موقعہ و محل کا انتظار ہے۔ علاوہ اس کے اریٹریا، حبشہ اور سومالی لینڈ میں اس نے اتنی زبردست ہوائی قوت فراہم کر رکھی ہے کہ انگریزوں کا کوئی جہاز بحر روم سے محفوظ نہیں گزر سکتا۔

اٹلی کی اس قوت کا جواب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ انگلستان کی فضائی قوت بھی اتنی ہی زبردست و مفید ہوتی، سو اس کا حال آپ گزشتہ اشاعت میں معلوم ہی کر چکے ہیں کہ وہ مقابلتاً کتنی ضعیف و کمزور ہے۔

بحری قوت میں سب سے بڑا درجہ انگلستان کا مانا جاتا ہے اس کے بعد امریکہ کا، پھر جاپان، فرانس، اٹلی، جرمنی اور روس کا۔ لیکن اب امریکہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ جاپان کی طرف سے ہر وقت اسے خطرہ رہتا ہے، تاہم چونکہ ابھی تک کسی جنگ میں اس کا تجربہ نہیں ہوا، اس لئے نہیں

کہا جا سکتا کہ وقت پر وہ کیسا ثابت ہو۔

جاپان کی بحری قوت تیسرے درجہ کی مانی جاتی ہے لیکن عملاً اس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے اور تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ جاپانی سپاہی سمندر میں نہایت بیجگری سے لڑتا ہے اور نظم و باقاعدگی بھی اس میں بہت پائی جاتی ہے۔

فرانس کی بحری قوت بھی زبردست ہے، لیکن اس کو اپنے مقبوضات کے تحفظ کے لئے (جن میں سے اکثر کا تعلق سواحل سے ہے) جہازوں کی بڑی تعداد ادھر اُدھر منتشر رکھنا پڑتی ہے اور اس لئے اسکی بحری قوت میں مرکزیت نہیں پائی جاتی۔

اٹلی کی بحری قوت کا انحصار زیادہ تر اس کی آبدوز کشتیوں پر ہے، جو بحر روم میں منتشر ہیں اور جن کو برطانوی و فرانسیسی جہاز باوجود انتہائی کوشش کے نہیں پا سکتے۔ ان آبدوز کشتیوں کی رفتار اتنی خاموش اور تیز ہے اور غوطہ زنی میں وہ اتنی مشاق ہیں کہ مشکل سے ان کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

روس کی بحری قوت قابل لحاظ نہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسی بندرگاہ یورپ و ایشیا میں نہیں ہے جو تمام سال کھلی رہے۔ تاہم بحر پاسیفک میں اس کی آبدوز کشتیاں اور تارپیڈو اتنی تعداد میں موجود ہیں کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو وہ جاپان کو کافی پریشان کر سکتا ہے۔

## بری و میکانکی قوت

اس لحاظ سے جرمنی سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ جنگ عظیم کے بعد عہد نامہ ورسائی کی رو سے جرمنی پر بڑی پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں، لیکن جب سے اس نے اس عہد نامہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور ہٹلر برسر اقتدار ہوا ہے، جرمنی نے اپنی فوجی قوت کے اضافہ میں حیرتناک اقدام کیا ہے۔ اسوقت تقریباً سارا ملک فوج ہے اور اگر ضرورت ہو تو فوراً ۵۰ لاکھ فوج وہ میدان میں لا سکتا ہے۔

فوجی بھرتی کا وہاں کیا اُصول ہے یہ بالکل راز کی بات ہے، لیکن اتنا سب کو معلوم ہے کہ اول تو وہاں ہر مرد و عورت کو ابتدا میں جسمانی ورزش کی تعلیم دیجاتی ہے اور اس کے بعد دو سال تک جبریہ فوج میں کام کرنا پڑتا ہے۔ باضابطہ فوج متعدد ڈویژنوں میں منقسم ہے اور ملک کی سرحد پر متعین ہوتی ہے۔

عہد نامہ ورسائی کی رو سے ٹینک اور بہت سے آلات حرب بنانا اس کے لئے ممنوع تھے، لیکن اب اس کی فوج جدید ترین آلات حرب سے آراستہ ہے۔ ہر طرح کی مشین گنیں، طیارہ شکن توپیں، رائفلیں اسکے پاس موجود ہیں اور وہاں کے سائنس داں رات دن جدید آلات حرب اختراع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں انھوں نے زہریلی گیس بھی ایک ایسی بنائی ہے جس کے اثرات کو نقاب وغیرہ روک نہیں سکتے، اور دم کے دم

میں عام ہلاکت اس سے پھیلائی جا سکتی ہے۔ شب و روز وہاں کے کارخانوں میں اسلحہ ڈھلتے رہتے ہیں اور ۷۵ میل کی مار کرنے والی بڑی بڑی توپیں کثیر تعداد میں وہاں پائی جاتی ہیں۔ ریلوں اور سڑکوں کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ تین لاکھ سپاہیوں کا محاذ پر آناً فاناً بھیج دینا کوئی بات ہی نہیں۔ اسی کے ساتھ جرمن سپاہی کی شجاعت و قوت تحمل کو بھی شامل کیجئے تو جرمن افواج کا بھرم بہت بڑھ جاتا ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں جس جرأت و پامردی کے ساتھ جرمن افواج نے اتحادیین کا مقابلہ کیا اس کو سب نے تسلیم کیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جرمنی کی شکست کا سبب اس کے افواج کی پست ہمتی نہ تھی بلکہ وہاں کی سویلین آبادی کی بےچینی تھی جو انقلاب کی صورت میں رونما ہوئی اور اب وہ ان تمام اقوام سے بدلہ لینا چاہتی ہے جن کی ریشہ دوانیوں نے اس کے ملک کو انقلاب سے دوچار کیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا ہے کہ دنیا میں کمزور کو جینے کا حق حاصل نہیں ہے اور اس کی کامیابیاں ظاہر کر رہی ہیں کہ اس نے جو کچھ سوچا ہے صحیح سوچا ہے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے درست کر رہا ہے۔

فرانس اپنی فوجی تنظیم کے لحاظ سے یورپ کا سب سے زیادہ قوی ملک سمجھا جاتا تھا، لیکن اب اسکی جگہ جرمنی نے لیلی ہے۔ امن کی حالت میں فرانسیسی افواج کی تعداد چار لاکھ پچاس ہزار ہے جو یورپ میں رہتی ہے علاوہ اس کے دو لاکھ فوج افریقہ و دیگر مقبوضات میں رہتی ہے اور ایک لاکھ مستقلاً خط میگونٹ پر رہتی ہے۔ (یہ وہ محاذ ہے جو جرمنی کے سرحد پر اس نے طیار کیا ہے اور اپنے استحکامات و زمین دوز قلعہ بندیوں کے لحاظ سے ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا ہے)۔ ٹینکوں، مشین گنوں، اور طیارہ شکن توپوں کی بھی کافی تعداد اسکے پاس موجود ہے۔

فرانسیسی سپاہی بھی اپنی جرأت و ہمت کے لحاظ سے مشہور ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ ملک کی سیاسیات سے بھی متاثر ہو جاتا ہے، جرمن سپاہی میں یہ بات نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ وہاں کی آبادی کا سوال بھی غور طلب ہے اس کی آبادی ۴ کروڑ ۰ ۵ لاکھ سے زیادہ نہیں بڑھ سکتی برخلاف اس کے جرمن آبادی آسٹریا اور سوڈیٹن کو ملا کر ۸ کروڑ ہوتی ہے۔ فرانس کی آبادی چونکہ گھٹ رہی ہے، اس لئے اسکو اپنی فوج کے لئے مراکش اور مغربی افریقہ سے بھی بھرتی کرنا پڑتی ہے جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی افریقہ کی سنگالی افواج گزشتہ جنگ میں خندقیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ نکلی تھی، مراکش کا سپاہی بہادر ہوتا ہے لیکن چونکہ اب مراکش اور الجیریا میں بھی جذبۂ قومیت قوی ہوتا جا رہا ہے اس لئے اب وہاں کی آبادی سے بھی زیادہ توقع نہیں رہی۔ یہی حال ریف کا ہے کہ اگر اب یورپ میں کوئی جنگ ہوئی تو وہ بھی آزاد ہونے کی کوشش کرے گا۔ ادھر اسپین میں فاسسٹی اثرات نے فرانس کے لئے اور زیادہ خطرات پیدا کر دئے ہیں۔

برطانیہ کی فوجی طاقت بحالت موجودہ صرف ۲ لاکھ ۳۰ ہزار ہے جس میں وہ ۶۰ ہزار گورے بھی شامل ہیں جو ہندوستان میں رہتے ہیں۔ فوجی بھرتی کے باب میں برطانیہ بہت بدقسمت واقع ہوا ہے۔ حال ہی میں ہوائی تاخت کی مدافعت کے لئے بیرون لندن کے لئے ۴۶۰۰۰ سپاہیوں کی ضرورت تھی لیکن بمشکل تمام ۸۰۰۰ آدمی مل سکے۔ حکومت نے لوگوں کو ترغیب دینے کے لئے جسمانی صحت کا معیار بھی کم کر دیا، چوتھے وقت کی غذا دینا بھی مفت قبول کر لیا، تنخواہیں بھی بڑھائیں، ترقیاں بھی دیں، لیکن خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

برطانیہ کی فوجی طاقت منتشر بھی بہت ہے۔ انگلستان میں صرف ایک لاکھ ۲۰ ہزار فوج رہتی ہے اور باقی مصر، چین، ریاستہائے ملایا، مالٹا، فلسطین اور جبرالٹر میں پھیلی ہوئی ہے۔ انگلستان میں مدافعت کے لئے ایک ٹریٹوریل فوج بھی ہے جو ۱۵۵۰۰۰ سپاہیوں پر مشتمل ہے اور منظور شدہ جمعیت سے ۴۸۰۰۰ کم ہے، وہاں زررو فوج بھی ۱۱۸۰۰۰ سپاہیوں کی پائی جاتی ہے، لیکن منظور شدہ تعداد سے ۱۳۰۰۰ کی اس میں بھی کمی ہے۔

فوج کو میکانکی حیثیت دینے میں البتہ انگلستان نے کافی ترقی کی ہے۔ اور مشین گنوں، ٹینکوں، مسلح موٹروں اور بھاری بھاری توپوں سے افواج کو مسلح کر دیا گیا ہے۔ لیکن توپخانوں کی قوت برطانیہ کی بہت ضعیف ہے

اس میں شک نہیں وہ نہایت تیزی سے بھاری بھاری توپیں بنا رہا ہے، لیکن دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں جو کمی پائی جاتی ہے اس کو پورا کرنا آسان نہیں۔

ہندوستان میں برطانوی فوج (گورے سپاہیوں کی) صرف ۴۳ بٹالین اور ۲۵۰ توپوں پر مشتمل ہے طیارہ شکن توپوں کی صرف ایک بیٹری ہے اور ٹینکوں کی صرف آٹھ کمپنیاں، سواروں کی صرف پانچ رجمنٹ ہیں۔ ہندوستانی فوج ایک لاکھ ۶۰ ہزار باضابطہ سپاہیوں پر مشتمل ہے اور ۱۴۰۰۰۰ افواج محفوظہ ہیں جن میں ۴۵۰۰۰ سپاہی ریاستوں کی فوج کے بھی شامل ہیں۔ الغرض برطانیہ کی بری قوت حد درجہ کمزور ہے اور میکانکی حیثیت سے بھی نسبتاً بہت پیچھے ہے، گو تامی اچھا لڑنے والا سپاہی ہے۔

اٹلی کی عسکری قوت بہت زبردست ہے۔ وہاں فوجی خدمت لازمی ہے اور ابتداء عمر سے شروع ہو جاتی ہے، وہاں ۶ لاکھ مستقل فوج ہے، تین مسلح موٹروں کے ڈویژن ہیں اور ایک میکانکی بریگیڈ ہے۔ حدود البائن کی حفاظت کے لئے علٰحدہ فوج مقرر ہے اور ایک مستعمراتی فوج بھی ہے جو لیبیا، صومالی لینڈ اور حبشہ کے سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے جغرافی جائے وقوع نے بحر روم کے وسط میں اس کی اہمیت کو نمایاں کر دیا ہے اور چونکہ برطانیہ کے مشرقی مقبوضات کا راستہ بحر روم ہی کی طرف سے ہے اس لئے اس نے

اٹلی کی مخالفت کو اپنے لئے خطرناک سمجھ کر ایک معاہدہ حال ہی میں کیا ہے جس کی رو سے اٹلی، بحر روم میں مزید فوجی استحکامات نہیں کر سکتا اور برطانیہ، نہر سویز کے راستہ کو کسی کے لئے نہیں روک سکتا۔ اٹلی کا سپاہی البتہ کوئی خاص شہرت نہیں رکھتا۔

سفید حکومتوں میں امریکہ کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ گزشتہ جنگ میں تقریباً ۳ لاکھ سپاہی بھرتی کئے گئے تھے اور ان میں آدھے فرانس بھیجے گئے تھے۔ اپنی اخلاقی حالت کے لحاظ سے امریکن سپاہی فرانسیسی اور برطانوی سپاہی سے بہتر ثابت ہوا ہے۔

بحالت امن امریکہ کی فوجی قوت دو لاکھ سے زیادہ نہیں ہے، لیکن ضرورت کے وقت لازمی بھرتی سے یہ تعداد بہت بڑھائی جا سکتی ہے۔ جاپان کے خطرہ نے اب اس کو فوج کے تمام شعبوں کی طرف متوجہ کر دیا ہے اور بحری، بری و ہوائی طاقت بڑھانے کے لئے بجٹ میں بڑی بڑی رقمیں منظور کی جا رہی ہیں۔

روسی فوج کی تعداد ۲۰ لاکھ ہے اور ۵ ہزار ٹینک۔ میکانکی حیثیت سے روس بہت ترقی کر رہا ہے تمام اسلحہ اور جدید آلات حرب وہیں طیار ہوتے ہیں۔ فوجی قوت کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ روس بہت وسیع ملک ہے اور وہاں جنگ کے وقت سب سے بڑی مشکل افواج کی نقل و حرکت میں پیدا ہوتی ہے، لیکن اب کثرت سے سڑکیں بن رہی ہیں اور اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جنگ کے وقت جلد اور بہ آسانی اِدھر سے اُدھر فوجیں بھیجی جا سکیں۔

چھوٹی سلطنتوں میں پولینڈ کی فوج سب سے بہتر ہے۔ اسوقت اس کی فوجی طاقت ۳ لاکھ ہے لیکن بحالت جنگ ۱۲ لاکھ تک پہونچ سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ کسی وقت روس کا مخالف ہو جائے تو قریب تر ہونے کی وجہ سے کافی نقصان پہونچا سکتا ہے۔ پولینڈ کے بعد زیک فوج ہے جس کی تعداد ۱۷۵،۰۰۰ ہے۔ سواحل ڈینوب پر واقع ہونے والے ممالک میں یہی ملک ایسا ہے جس کی صنعت اسلحہ سازی خاص طور پر قابل ذکر ہے، یہاں کا کارخانہ اسکوڈا، ٹینک، بندوقیں، مشین گنیں، توپیں اور کارتوس وغیرہ بنانے میں خاص شہرت رکھتا ہے اور تمام ممالک کو یہ چیزیں فراہم کرتا ہے۔

منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا جس نے جرمنی کو یہاں اپنا اقتدار قائم کرنے پر مجبور کیا۔

اسپین میں جنرل فرانکو کی فوج کی تعداد ۱۰ لاکھ ہے اور اس قدر آراستہ ہے کہ فرانس کو اس طرف بھی اپنے حدود مستحکم کرنے کی طرف توجہ کرنی پڑ رہی ہے۔ پرتگالی فوج بہت کم ہے اور اس کی حالت بھی اچھی نہیں رومانیا، بلغاریا، جکوسلیویا میں سے ہر ایک کے پاس ڈھائی لاکھ فوج ہے۔ ترکی کے پاس دو لاکھ فوج ہے لیکن یہ اپنی جرأت کی وجہ سے دس لاکھ پر بھاری ہے۔ اب وہاں میکانکی قوت کو بھی بڑھایا

جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی اس کو اپنی طرف ملانا چاہتا ہے اور فرانس و برطانیہ اپنی طرف۔ لیکن ترکی کا میلان زیادہ تر برطانیہ کی طرف ہے، چنانچہ ابھی ان دونوں میں بوقت جنگ ایک دوسرے کو مدد دینے کا معاہدہ ہو چکا ہے۔

## جنگ کے جدید آلات

قوموں کی فوجی طاقت کے سلسلہ میں یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ جدید ذرایع حرب کیا ہیں گزشتہ جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے جنگ کا جو نظریہ تھا اسے جنگ نے بدلدیا اور اب اگر لڑائی ہوئی تو لوگ جنگ عظیم کو بھی بھول جائیں گے۔ غیر دخانی بارود، میگزین رائفل سریع العمل بڑی بڑی توپیں اور ٹینک، گزشتہ جنگ کی یادگاریں ہیں، لیکن آیندہ جنگ میں اور کن کن چیزوں سے کام لیا جائے گا اور موجودہ آلات حرب کتنی ترقی یافتہ صورت میں نظر آئیں گے اس کا حال تو لڑائی ہی میں کھلے گا۔

گزشتہ جنگ میں جب آراس پر حملہ کیا گیا تو ۲ لاکھ ۷۰ ہزار گولے صرف ہوئے۔ کارزار مسیین میں اُنیس دن تک گولہ باری ہوئی اور ۳۲۰ ٹرینیں ذخایر حرب سے لدی ہوئی صرف ہوئیں۔ دستی گولے یا بم ۲۸۲۰۰۰ بم پھینکے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۵ مربع میل جگہ پر قبضہ ہو سکا، گویا فی مربع میل نو ہزار آدمی ضایع اور ۲۰ لاکھ پونڈ نذر آتش ہوئے۔

گزشتہ جنگ میں ہلاکت پھیلانے کے لئے زہریلی گیس سب سے پہلی مرتبہ استعمال کی گئی توپوں سے تو خندقیں اور فوجی استحکامات برباد کئے جاتے تھے اور گیس سے عام انسانی ہلاکت پھیلائی جاتی تھی۔ اس کے دفعیہ کے لئے نقاب ایجاد کی گئی لیکن چونکہ بھاری ہونے کی وجہ سے ہر دو فریق کے لئے ناقابل برداشت تھی اس لئے بعد کو گیس و نقاب دونوں کا استعمال بہت کم کیا گیا۔

تیسری اہم ایجاد ٹینک[1] ( Tank ) کی تھی۔ یہ ایک مسلح آہنی گاڑی ہوتی ہے جس میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی توپیں یا مشین گنیں نصب ہوتی ہیں اور ہر جگہ بلا لحاظ نشیب و فراز اپنے سامنے کی تمام چیزوں کو کچلتی روندتی چلی جاتی ہے۔ یہ برطانوی ایجاد تھی، لیکن اس کا استعمال زیادہ نہیں ہوا۔ اب ایک چیز اس کے توڑ کی ایجاد ہو گئی ہے اور اسی لئے اسپین اور حبشہ میں ٹینکوں کا استعمال کچھ مفید ثابت نہ ہوا تاہم اگر کسی فریق کے پاس ٹینکوں کی تعداد زیادہ ہو تو فریق ثانی کے مقابلہ میں کامیابی کی امید اسے زیادہ ہونا چاہئے۔

---

[1] اس کو ٹینک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں یہ طیار ہو رہے تھے تو لوگ دریافت کرتے تھے کہ یہ کیا ہے تو ان سے کہدیا جاتا تھا کہ ٹینک ہیں۔ اس کو عربی میں دبابہ کہتے ہیں۔

سواروں کی رجمنٹوں کے بجائے حملہ کرنے کے لئے اب ہلکے ٹینک اور مسلح گاڑیوں کا رواج زیادہ ہو گیا ہے اور بہت کار آمد ثابت ہوا ہے۔ لیکن ان تمام چیزوں سے زیادہ اہم گیس اور بمبار ہوائی جہاز ہیں اور ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ آیندہ جنگ میں محارب فوجوں کو اتنا نقصان نہ پہونچے گا جتنا شہری آبادی کو اور یہ قصداً اس لئے کیا جائے گا کہ حکومت کا اندرونی نظام اور اجتماعی سکون برباد ہو جائے اور فوجوں کو کسی طرف سے اعانت نہ پہونچ سکے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بہ نسبت حملہ کرنے کے مدافعت کرنا زیادہ مناسب ہوگا، لیکن یہ یقین ہے کہ حملہ و دفاع کی جو صورتیں بھی اختیار کی جائیں آیندہ جنگ کے نقصانات استنے زبردست ہوں گے کہ انسانیت اسے کسی طرح برداشت نہ کر سکے گی۔

مسٹر اسٹیفن پوسنی ماہر جنگ کا خیال ہے کہ آیندہ جنگ اگر دو برابر قوت والے فریقوں میں ہوئی تو دونوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔ انھوں نے ۰۰ ۷ میل کا محاذ فرض کر کے جنگ کی طیاری و ہلاکت کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

| آلات حرب | ابتدائی | | سالانہ | |
|---|---|---|---|---|
| | حملہ | مدافعت | حملہ | مدافعت |
| مشین گنیں | ۱۰۰۰۰ | ۸۰۰۰۰ | ۲۰۰,۰۰۰ | ۱۶۰,۰۰۰ |
| توپیں | ۲۳۰۰۰ | ۱۵۰۰۰ | ۴۵۰۰۰ | ۳۰۰۰۰ |
| ٹینک شکن توپیں | ۱۶۰۰۰ | ۸۰۰۰ | ۳۰۰۰۰ | ۱۵۰۰۰ |
| طیارہ شکن توپیں | ۲۵۰۰۰ | ۲۵۰۰۰ | ۵۰۰۰۰ | ۲۸۰۰۰ |
| مسلح گاڑیاں | ۴۰۰۰۰ | ۱۳۰۰۰ | ۱۲۰۰۰۰ | ۲۵۰۰۰ |
| بدرقہ طیارے | ۳۱۰۰۰ | ۱۱۰۰۰ | ۸۵۰۰۰ | ۲۸۰۰۰ |
| بمبار جہاز | ۲۲۰۰۰ | ۵۰۰۰ | ۶۵۰۰۰ | ۱۵۰۰۰ |

ان آلات کے ساتھ ۳۰ لاکھ سپاہی مدافعت کے لئے اور اس سے دو چند حملہ کرنے کے لئے درکار ہونگے اگر اس میں ہوائی فوج کو بھی شامل کیا جائے تو پھر ۵۵ لاکھ آدمی مدافعت کے لئے اور ۶۵ لاکھ حملہ کے لئے چاہئیے۔ لیکن یہ تعداد تو صرف سپاہیوں کی ہوئی، اس میں اُس غیر محارب تعداد کو بھی شامل کیجیے جو فوج کی ضروریات فراہم کرنے کے لئے درکار ہوتی ہے تو پھر یہ تعداد ۵ کروڑ اور ۸ کروڑ سے متجاوز ہو جاتی ہے۔

یہ تو اندازہ ہوا صرف افواج و آلات حرب کا - اب اسی کے ساتھ آپ اس حقیقت پر بھی نگاہ ڈالئے کہ جسوقت ہوائی جہازوں سے بم گرائے جائیں گے، زہریلی گیس منتشر کی جائے گی تو شہری آبادی اور ملکی صنعت گاہوں کا کیا حال ہوگا۔ ملک کا ہر ہر متنفس خطرہ میں ہوگا اور تمام صنعتیں تباہ و برباد ہو جائیں گی۔

ہوائی جہازوں کے حملہ اور گیس سے بچنے کے لئے تدابیر کی جارہی ہیں، لیکن اسوقت تک پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر شہر کے اوپر آہنی تاروں کی چادر پھیلا دی جائے تو ہوائی جہاز نیچے نہ آسکیں گے، لیکن جرمنی نے اب ایسے جہاز بھی طیار کئے ہیں جو ان تاروں کو کاٹ کر نکل جائیں گے۔

الغرض آیندہ جنگ کا خطرہ ایسی ہولناک چیز ہے کہ اس کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اس نے کسی وقت واقعہ کی صورت اختیار کر لی تو نہیں کہا جا سکتا کہ کرۂ زمین کی تباہیاں کتنی دردناک اور کس قدر وسیع ہوں گی۔


# آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں

| نگارستان | جمالستان | ترغیبات جنسی | شہاب کی سرگزشت | استفسار و جواب ہر سہ جلد |
|---|---|---|---|---|
| دو روپیہ | چار روپیہ | تین روپیہ | ایک روپیہ | نو روپیہ |
| **معرکۂ سخن** | **مکتوبات نیاز** | **اردو شاعری** | **ہندی شاعری** | **میزان کل** |
| ڈھائی روپیہ | ڈھائی روپیہ | دو روپیہ | ڈیڑھ روپیہ | ستائیس روپیہ آٹھ آنے |

## لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں ملجائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

# تاریخ اودھ کا ایک ورق

## (نواب پادشاہ بیگم)

نواب پادشاہ بیگم، غازی الدین حیدر کی خاص محل تھیں۔ جو سنہ ۱۸۱۴ء سے سنہ ۱۸۲۷ء تک فرمانروائے اودھ رہے۔ بیگم کے والد مبشر الدولہ، محمد شاہ شہنشاہ دہلی کے منجم تھے۔ سلطنت دہلی کا منجم اُس زمانہ میں صاحب منصب ہوتا تھا موصوفہ کی شادی غازی الدین حیدر کے ساتھ سنہ ۱۷۹۴ء میں حسب منشا شہنشاہ دہلی بمقام بنارس ہوئی تھی۔ اسوقت نواب آصف الدولہ مسند آرائے صوبہ اودھ تھے اور اُن کے مختلف البطن برادر نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں پدر غازی الدین حیدر محلہ درگاکنڈ بنارس میں مقیم تھے۔

دوران حکومت غازی الدین حیدر میں بعض فتنہ پردازوں نے شاہ موصوف کو پادشاہ بیگم اور نصیر الدین حیدر کی طرف سے بدگمان کردیا تھا کہ یہ دونوں ماں بیٹے زہر دیکر آپ کے چراغِ زندگی کو بجھانا چاہتے ہیں نصیر الدین حیدر غازی الدین حیدر کے بیٹے مسماۃ صبح دولت المخاطب بہ ممتاز محل کے بطن سے تھے اُن کی ماں وضع حمل کے بعد ہی مرگئی تھیں اس لئے پادشاہ بیگم نے اُن کو اپنا بیٹا بناکر بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ غازی الدین حیدر چاہتے تھے کہ نصیر الدین حیدر کو اپنے قابو میں لاکر اس کانٹے کو ہمیشہ کے لئے دور کردیں تاکہ آیندہ کسی خلش کا اندیشہ نہ رہے مگر پادشاہ بیگم نے یہ منشا پورا نہ ہونے دیا۔

بادشاہ نے اپنی جان کے خوف سے دونوں ماں بیٹوں کو زیر حراست کردیا۔ جب سنہ ۱۸۲۷ء میں غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا تو دونوں کی قید و بند سے گلوخلاصی ہوئی اور نصیر الدین حیدر کے سر کو تاج شاہی سے زینت دیگئی مگر صاحب تاج و تخت ہونے کے بعد نصیر الدین حیدر نے بھی پادشاہ بیگم کے ساتھ وفا نہ کی بلکہ ایک معمولی سی بات پر محلخانۂ سلطانی اُن سے خالی کرالیا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ کی ایک نہایت چہیتی و دلنواز بیوی قدسیہ بیگم نے کسی وجہ سے زہر کھاکر جان دیدی تھی اس داغِ مفارقت سے نصیر الدین حیدر بہت ہی بے چین و بے قرار تھے۔ کسی طرح صبر نہ آتا تھا۔ نہ محفل میں دل بہلتا تھا نہ ویرانے میں۔ اسی وحشت مزاجی کے عالم میں انھوں نے

حکم نافذ کردیا کہ سب اعزہ و متوسلین ایک مدت معینہ تک سیاہ ماتمی لباس پہنیں مگر بیگم نے یہ عذر کرکے کہ میں صرف امام حسینؑ کے غم میں سیاہ پوش ہوتی ہوں، بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہ کی اس پر بادشاہ بہت چراغ پا ہوئے اور بیگم کو عاجز و پریشان کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا چنانچہ رزیڈنٹ کے سمجھانے سے بیگم بیرون شہر باغ الماس علیخاں میں فروکش ہوئیں اور اپنے ناسپاس بیٹے سے مقابلہ کے لئے ایک جرار فوج بھی ملازم رکھی۔ اب مضافات لکھنؤ میں ایک دوسری زبردست سرکار بھی قایم ہوگئی۔ نہ اِدھر کا آدمی اُدھر جاتا تھا نہ اُدھر کا ادھر آنے پاتا تھا ہر وقت جھڑپ کا اندیشہ تھا دونوں کو ایک دوسرے کا دغدغہ لگا رہتا تھا۔ اس خدشہ کو نصیرالدین حیدر کی قبل از وقت موت نے دور کر دیا۔

بر وقت تخلیۂ محلسرا نصیرالدین حیدر نے چاہا تھا کہ اپنے بیٹے مرزا رفیع الدین فریدوں بخت عرف محمد مہدی مُنّا جان کو بیگم کے قبضہ سے نکال کر ہلاک کردے مگر جس طرح بیگم نے نصیرالدین حیدر کی حمایت میں غازی الدین حیدر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اُسی طرح مُنّا جان کی حفاظتِ جان کے لئے سینہ سپر ہوگئیں۔ اس پر نصیرالدین حیدر نے ضد میں آکر منا جان کے پسر ناجائز ہونے کے اشتہارات چھپوا کر تمام شہر میں چسپاں کرادیے تاکہ بیگم کا مقصد پورا نہ ہو اور منا جان تاج و تخت سے محروم ہو جائیں حالانکہ اس کے قبل وہ اُن کو اپنا پسر جایز تسلیم کر چکے تھے۔

بعد وفات نصیرالدین حیدر سنہ ۱۸۳۷ء میں بیگم نے منا جان کو خلاف منشا ایسٹ انڈیا کمپنی محض اپنی ہمت مردانہ اور زور ازوری سے لال بارہ دری میں تخت نشین کردیا جس پر توپیں لگادی گئیں۔ کثرت سے گولیاں چلیں تلوار سے تلوار بجی، بہت ہی کشت و خون ہوا سیکڑوں جوان رعنا موت کے گھاٹ اُترے۔ لہو کی ندیاں بہہ گئیں مگر بدقسمتی سے نتیجہ میں موصوفہ کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا اور دونوں ماں بیٹے سخت حراست میں لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے قلعہ چنار گڑھ بھیج دئے گئے اور دونوں کی بسر اوقات کے لئے لکھنؤ کے خزانہ سے ایک رقم مقرر کردی گئی بیگم کی شکست کے بعد نصیرالدین حیدر کے ایک چچا نصیرالدولہ محمد علی خاں حسب الحکم خداوندان کمپنی تخت سلطنت پر بٹھائے گئے جنھوں نے محمد علی شاہ کا لقب اختیار کیا۔

منا جان اپنے باپ کے بیٹے تھے۔ نصیرالدین حیدر کے اکثر خصایل ان میں پائے جاتے تھے۔ آب آتشین سے بھی بکثرت شوق کرتے تھے۔ آخر سنہ ۱۸۴۶ء میں مرگ ناگہانی کے شکار ہوگئے اور چنار گڑھ ہی میں پیوند زمین ہوئے اُن کی رحلت کے بعد (سنہ ۱۸۴۷ء) میں بیگم کو بھی فرشتہ اجل نے مکروہات زمانہ سے ہمیشہ کے لئے نجات دیدی اور چنار گڑھ ہی اُن کا بھی دائمی خواب گاہ بنا۔

اُن کی رحلت کی خبر سنکر امجد علی شاہ (پسر محمد علی شاہ) نے مولوی نہال الدین خاں کو برائے ضبطی مال و اسباب چنار گڑھ روانہ کیا اور حکم دیا کہ پسماندگان منا جان کو مع نقد و جنس دم دلاسا دیکر لکھنؤ لے آدیں۔

مولوی صاحب موصوف سب کو لیکر لکھنؤ آرہے تھے کہ امجد علی شاہ قضا کر گئے۔ جب منا جان کی بیوی بچے اور والدہ افضل محل لکھنؤ کے ناکہ پر پہونچیں تو واجد علی شاہ کا حکم پہونچا کر ان لوگوں کو پھر چنار گڑھ پہونچا دو چنانچہ پھر سب وہیں پہونچا دئے گئے۔

بادشاہ بیگم بڑے طنطنہ کی خاتون تھیں، چنانچہ ولایت کی ایک سیاح عورت نے ان کا حال اس طرح لکھا ہے کہ:-

بادشاہ بیگم باعتبار اعزاز و مراتب کسی دوسرے ملک کی ملکہ سے کم نہیں ہیں۔ علاوہ خطاب کے اُن کو بارگاہ خسروی سے اور بھی مخصوص امتیازات حاصل ہیں مثال کے طور پر ڈنکہ ہی کو لے لیجیے جو اُن کی سواری کے آگے ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا امتیازی نشان ہے جس کے استعمال کی جہاں پناہ نے اپنے خاندان کی اور کسی خاتون کو اجازت نہیں دی ہے مگر چھتر اور آفتابہ یعنے زردوزی سایہ بان اور طاؤس کے پروں کی چوڑی ملکہ کے علاوہ دوسری بیگمات شاہی بھی اپنی سواری کے ساتھ استعمال کر سکتی ہیں۔ ایک جلوس کا حال اس طرح بیان کرتی ہیں کہ جلوس کے شروع میں مجھے ایک دستہ سوار محافظین کا وردی میں نظر پڑا جن کے نیزوں کے پھرہرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اُن کے بعد دو پلٹنیں پیادوں کی تھیں جن کے ہمراہ باجہ والوں کے غول اور بیرق بردار بھی تھے۔ اُن کے پیچھے ایک کمپنی نیزہ بردار پیادوں کی تھی جو نفیس اور بے داغ سفید پوشاکیں پہنے تھے اور اُن کے سروں پر بھی سفید پگڑیاں تھیں۔ ہاتھوں میں قرمزی رنگ کی چھوٹی چھوٹی مثلث نما جھنڈیاں تھیں جن پر دونوں جانب دو مچھلیاں اور درمیان میں ایک عجیب قسم کا خنجر زردوزی کڑھا ہوا تھا۔ یہ جھنڈیاں تقریباً ۳ فٹ لمبی چھڑی کی تھیں جن کے زیریں حصے میں چھوٹی چھوٹی سنگینیں پنہاں تھیں جو کھٹکا دبانے سے نمودار ہو جاتی تھیں۔ اُن کے عقب میں پورا غول باجہ والوں۔ ڈھول اور شہنائی نوازوں کا تھا پھر وہ مہتم بالشان ڈنکہ شاہی تھا جو عوام الناس میں سواری کے جاہ و حشم کا اعلان کرتا ہے۔ ملکہ ایک بلند اور پرشوکت چنڈول میں سوار تھیں جس کے دونوں جانب خوش پوشاک اور معتمد ملازمین جو اسی خدمت پر مامور کئے جاتے ہیں چنوریاں اور آفتابے لئے ہمراہ تھے۔ چنڈول نفس سے مشابہ ہوتا ہے مگر بڑا اور زیادہ بلند ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ چھ فٹ لمبا پانچ فٹ چوڑا اور چار فٹ بلند ایک مختصر سا نقرئی کمرہ ہوتا ہے جس کے زیریں حصے میں آگے پیچھے چاندی کے خول چڑھے ہوئے چار ڈنڈے لگے ہوتے ہیں جن کو بیس کہار اپنے کاندھوں پر رکھ کر لے چلتے ہیں۔ ہر چوتھائی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد کہاروں کی بدلی ہو جاتی ہے پھر وہ کہار لے چلتے ہیں جو ہمراہ سواری ہوتے ہیں۔ منزل مقصود کے پہونچنے تک کہاروں کی بدلی اسی طرح ہوا کرتی ہے چنڈول بردار خوشنما سفید کپڑے کی وردی زیب تن کئے ہوئے تھے جو ٹھیک اُن کی ناپ کی

بنائی گئی تھی۔ اس کے اوپر قرمزی رنگ کے ڈھیلے ڈھیلے لبادے پہنے تھے جن کے حاشیوں پر سنہرا زردوزی کام بنا تھا اور پشت پر بھی ایک کارچوبی مچھلی بنی ہوئی تھی۔ اُن کی پگڑیاں لبادوں کے ہمرنگ تھیں اور سر پگڑی کی بغل میں ایک طلائی مچھلی ٹنگی ہوئی تھی جس کی دُم سے ایک قیمتی اور خوشنما سنہرا پھندنا لگا ہوا تھا جو اتنا لمبا تھا کہ چلتے وقت کہاروں کے شانوں کو مس کرتا تھا۔

چنڈول کے اردگرد نہایت طرحدار اور قوی الجثہ کہاریاں بھی تھیں جو نہایت زرق برق لباس پہنے زیوروں سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی بناؤ سنگار کئے مٹکتی چمکتی چلی جاتی تھیں۔ ان کہاریوں کا فرض یہ ہے کہ سواری کو صحن زنانخانہ میں پہونچادیں۔ سونٹہ بردار اور چوبدار بھی بہ تعداد کثیر ہاتھوں میں طلائی اور نقرئی عصا لئے ہوئے چنڈول کے گرد وپیش تھے جو سواری کے اعزاز و مراتب کا باآواز بلند کڑکا لگا رہے تھے۔ یہ لوگ فقرو مساکین کے غولوں کو بھی چنڈول کے پاس پھٹکنے نہیں دیتے جو صاحب سواری کی شہرہ آفاق فیاضی اور دریادلی کی وجہ سے ایسے موقعوں پر ٹڈی دل کی طرح جمع ہوجاتے ہیں مگر بیگم اپنے چند خواجہ سراؤں کی معرفت جو چنڈول کے قریب ہی چلتے رہتے ہیں ایک معتدبہ رقم مروجہ دستور کے موافق دفعہ دفعہ کرکے لٹوا دیتی ہیں جن کو محتاج اور گداگر چھین جھپٹ کر لوٹ لیجاتے ہیں۔

خواجہ سراؤں کا سردار یعنے نواب ناظر، چنڈول کے پیچھے ہاتھی پر جس کی مخملی جھول پر بھاری سنہرا کارچوبی کام بنا تھا ایک جگمگاتے ہوئے ہودج میں متمکن تھا اور نہایت نفیس　　　کی پوشاک میں ملبوس تھا۔

نواب ناظر کے بعد، عملہ کی اور ذی عزت بیگمات تھیں جو اپنے مرتبہ کے لحاظ سے پردہ دار فنسوں میں سوار تھیں جن کی نگرانی نیزہ بردار اور چوبدار پورے طور سے کر رہے تھے۔

ان بیگمات کے بعد خانگی عملہ کے چند افسران نہایت سجیلے ہاتھیوں پر سوار تھے سب کے آخر میں ادنیٰ درجہ کی خادمائیں، لونڈیاں باندیاں رتھوں پر سوار تھیں۔ ان رتھوں میں بیل جتے ہوئے تھے جن کی گردنوں میں ڈوری سے بندھی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں جن کے چلتے وقت یکساتھ بجنے سے ایک عجیب قسم کی خوشگوار سریلی آواز پیدا ہوتی تھی۔ رتھ ایک چوڑی چکلی پہیہ دار گاڑی ہوتی ہے جس کے بالائی ڈھانچہ کی چھت پر دو قبے ہوتے ہیں جن میں سے ایک بمقابلہ دوسرے کے کسی قدر بڑا ہوتا ہے۔ گاڑیوں پر سرخ کپڑے کی پوششیں جن کے کناروں پر سنہرا یکا یا زرد رنگ کی گوٹ لگی تھی۔ جو لوگ رتھوں پر سوار ہوتے ہیں وہ گدوں پر بیٹھتے ہیں۔ آگے کی جانب پوشش کے ہمرنگ ایک موٹے کپڑے کا پردہ پڑا ہوتا ہے جو سواریوں کو باہر والوں کی نظروں سے چھپائے رہتا ہے۔ رتھ بان اور پردہ کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی اس میں　　　بطور نگہبان بٹھادی گئی تھیں جو سن سے اتری ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کو باہر کی چہل پہل دیکھنے۔ مجمع کی سیر کرنے اور پردہ کے باہر کی پاک وصاف ہوا سے لطف اندوز ہونے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی۔ بادشاہ بیگم کی سواری میں رتھیں پچاس تھیں اور ہر رتھ میں چار سے چھ تک عورتیں سوار تھیں یہ سب خواصیں اور مغلانیاں تھیں۔ یہ جلوس اوسط درجہ کی چال سے میرے مکان کے سامنے سے تقریباً نصف گھنٹہ میں گزرا ہوگا۔

شیخ تصدق حسین

# باب الاستفسار

## ایران اور شیعی حکومت

(جناب سید محمد عسکری صاحب ۔ ناگپور)

اگر تکلیف نہ ہو تو ازراہ کرم تاریخ ایران کا وہ حصہ جو مسلمانوں کے حملہ سے متعلق ہے تحریر فرمایئے اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ یہاں شیعی حکومت کب اور کیونکر قایم ہوئی۔

---

(نگار) عرب و ایران کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ ابھی ظہور اسلام بھی نہ ہوا تھا کہ ایک طرف شاپور اول کے زمانہ سے اہل عرب نے جنوبی ایران میں آباد ہونا شروع کر دیا تھا اور دوسری طرف جنوبی عرب پر ساسانیوں کی حکومت رسول اللہ کے عہد تک پائی جاتی تھی۔ ایران کی اسلامی تاریخ بہت وسیع و پیچیدہ ہے اور باب الاستفسار اس پر گفتگو کی گنجایش نہیں، تاہم نہایت اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔

خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ایران پر حملہ کیا گیا اور ۶۳۷ء میں جب جنگ قادسیہ ہوئی تو ساسانیوں کے پایۂ تخت مداین پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد اسلامی تاخت وسیع ہوتی گئی اور خلیفہ ثالث کے وقت تک سوائے کرمان و کابل کے بلخ تک ہر جگہ مسلمان پھیل گئے، لیکن ایران کے قدیم شاہی خاندان کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کو ایک اور جماعت سے لڑنا پڑا۔ یہ مرزبانوں کی جماعت تھی جنھوں نے خراج دیکر اپنی مذہبی و تمدنی آزادی حاصل کی تھی اور اس استحقاق کی بنا پر وہ جنگ کرتے تھے۔

عربوں نے ایران کو تو فتح کر لیا تھا، لیکن ایرانیوں کو ابھی تک مغلوب نہ کر سکے تھے اور مذہب اسلام کا ابھی عام رواج نہ ہوا تھا۔ چنانچہ سوائے قزوین کے کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں کی آبادی سب کی سب مسلمان ہو گئی ہو۔ زردشتی مذہب بدستور پایا جاتا تھا۔

خلیفۂ چہارم کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کا تسلط زیادہ مستحکم نہ ہوسکا اور اندرونی بےچینیوں نے ان کے اقدامات کو وسیع نہ ہونے دیا۔ عراق کی بدامنی، خراسان کی بغاوت، بلخ پر چینیوں کا تسلط وغیرہ خلیفۂ چہارم ہی کے عہد کی باتیں ہیں۔ لیکن بعد کو جب بنی امیہ کا دور شروع ہوا تو زیاد اور حجاج کی قیادت میں پھر نئی قوت کے ساتھ سلسلۂ فتوح شروع ہوا اور کابل و سیستان تک اس کا سلسلہ وسیع ہوگیا۔

امویوں کا مقصود حکومت اسلام کی اشاعت نہ تھی بلکہ صرف جزیہ و خراج وصول کرنا تھا، البتہ حجاج نے یہ ضرور کیا کہ عراق میں دفتری تحریر بجائے فارسی زبان کے عربی میں کردی۔ اور اس طرح دوسرے ایرانی صوبوں میں بھی رفتہ رفتہ عربی زبان کا اثر قایم ہوگیا۔ لیکن ایران میں اسلام کی اشاعت فی الحقیقت عمر وبن عبدالعزیز اور ہشام کے زمانہ میں ہوئی۔ کیونکہ انھوں نے جزیہ پر زیادہ زور نہیں دیا اور اس طرح جزیہ سے بچنے کے لئے بہت سے ایرانی مسلمان ہوگئے اور رفتہ رفتہ میل جول سے اسلام کے اثرات وسیع ہونے لگے۔

اس کے بعد جب ابومسلم خراسانی نے عباسیوں کے اثرات ایران میں قایم کئے اور حکومت بنوامیہ کے ہاتھ سے نکل کر بنوعباس کے ہاتھ میں گئی تو ایرانی روایات اور ایرانی تہذیب و معاشرت کا اثر بہت کچھ عربوں پر پڑا۔ اس اثر کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پہلوی زبان کی کتابیں عربی میں منتقل ہونے لگیں اور خاندان برمک (بنو نوبخت) برسر اقتدار ہوگیا۔ یہی تھا وہ زمانہ جب شعوبی تحریک شروع ہوئی اور زنادقہ کے ظہور نے مذہبی حلقوں میں بےچینی پیدا کردی۔ ہر چند خاندان عباسیہ نے ایرانی علاقہ کی طرف بڑی توجہ کی لیکن انتشار و بدامنی برابر جاری رہی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس حصۂ ملک پر پورا تسلط قایم ہوگیا ہو۔ چنانچہ خراسان کی مسلسل بغاوتوں کی وجہ سے خود خلفاء عباسیہ کو وہاں جانا پڑا اور آخر کار مامون الرشید کے زمانہ میں یہ حصہ تقریباً آزاد ہوگیا۔ پہلے طاہر بن الحسین گورنر خراسان نے آزادی اختیار کی اور طاہریہ خاندان کی حکومت وہاں قایم ہوگئی اس کے بعد لیث بن صفار نے قبضہ کرلیا اور صفاریہ خاندان حکمراں رہا۔ اس کے بعد سامانی خاندان آیا جو بہت زیادہ اہم تھا۔

مغربی ایران کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ ہارون الرشید ہی کے زمانہ میں زیدی علوی تحریک دیلم و جیلان میں شروع ہوگئی تھی اور متعدد بانی سرداروں نے اپنی اپنی حکومتیں قایم کرلی تھیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ مستحکم دودیر یا بویہ خاندان تھا، جنھوں نے نہ صرف تمام مغربی ایران پر تسلط قایم کرلیا بلکہ بغداد بھی فتح کرلیا اور خلافت کا اثر برائے نام رہ گیا۔

اس زمانہ میں جو کیفیت سیاسی ہیجان و انتشار کی تھی وہی مذہبی آب و ہوا کی بھی تھی، یعنی، تشیع، اعتزال، روایات پرستی (اہل حدیث) تصوف سبھی کچھ پایا جاتا تھا اور جغرافی حیثیت سے تقسیم اس طرح

پر تھی کہ مشرقی ایران میں سنیوں کا اثر تھا اور مغربی ایران میں شیعوں کا۔

اس کے بعد دسویں صدی عیسوی میں ترکوں کا زور ہوا جو سامانی حکومت کے ساختہ پرداختہ تھے یہ تمام ایران پر کابل تک چھا گئے، لیکن اسی دوران میں سلجوقیوں کی ترقی ہوئی اور ان کا مذہب سنی تھا، لیکن مغربی ایران میں اسماعیلی پروپاگنڈا کی وجہ سے شیعی مذہب زیادہ قوی ہوتا جا رہا تھا۔ ترکوں کے بعد مغلوں کا زمانہ آیا اور اس کے بعد چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں تیمور لنگ نے ایران کو فتح کیا۔ ہر چند اس کے زمانہ میں بھی عام اثر سنی مذہب ہی کا رہا لیکن مغربی ایران بدستور شیعہ مذہب کا پیرو تھا اس کے بعد صفوی خاندان کا اقتدار شروع ہوا اور فی الاصل یہی وہ زمانہ تھا جب ایران میں شیعہ مذہب بہ جبر پھیلایا گیا۔

اس خاندان میں سب سے پہلا فرمانروا جس نے مذہب تشیع کی بہ جبر اشاعت کی شاہ اسماعیل اور شاہ عباس صفوی کا زمانہ گویا پورے عروج کا تھا۔ چونکہ صفوی خاندان نے عرصہ تک ایران میں حکومت کی اور مخالف جماعتوں کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے بڑی حد تک امن و سکون بھی قایم رہا۔ اس لئے شیعی مذہب کی نشر و اشاعت زیادہ قوت کے ساتھ ہوئی۔ البتہ بعد کو سنیوں کی جماعت نے حکومت سے منحرف ہو کر متعدد جنگوں کے بعد افغانستان میں اپنی حکومت علحدہ قایم کر لی۔

صفویوں کے بعد قاچاریوں کی حکومت ہوئی اور یہ بھی شیعہ تھے۔ قاچاری حکومت ۱۹۲۵ء تک قایم رہی، اس کے بعد پہلوی حکومت کا دور آیا جو اسوقت تک قایم ہے۔

# نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں، جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(سنہ ۲۶ء) جنوری ۵ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی ۴ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۲ء) جنوری ۱۲ر۔ فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۳ء) فروری و جولائی ۴ر (سنہ ۳۴ء) فروری ۵ر۔ (سنہ ۳۵ء) فروری، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۶ء) جنوری عہ۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی، جون و ستمبر) ۶ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری عہ۔ مارچ تا اگست ۶ر فی پرچہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

# مکتوبات نیاز

بندہ نواز

دل کا خون کرنے کے لئے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بسا اوقات کبھی "فرصت یک نگہ" بہت ہوتی ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کی تکمیل چاہے تو بہ اندازۂ تماشائے تکلیف" وقت بھی زیادہ درکار ہوتا ہے۔

آپ کا مسلک یہی ہے اور اسی لئے میں ہمیشہ آپ سے خائف رہا۔ اب کہ آپ پھر وہی رسم و راہ تازہ کرنا چاہتے ہیں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ خدانخواستہ آپ کی خنجر آزمائی پر" زندہ کنی و باز کشی" کا وقت تو نہیں آپڑا؟ یا یہ کہ "آئین بے مہری" کی کوئی "طرح نو" ڈالنا تو مقصود نہیں ہے۔ اگر حقیقت وہ ہے تو پہلے صف اولین کے "شہدا" پر توجہ فرمایئے اور اگر صورت یہ ہے تو ایسا دل ڈھونڈھئے جس کی "صدائے شکست" میں کچھ جھنکار پیدا ہو اور آپ کو لطف آئے۔ یہاں کہ دل پہلے خاکستر ہوا اور پھر خاکستر صرف ہوا ہوئی، آپ کا ذوق کیا آسودہ ہو سکتا ہے!

مجھ میں فراست مومن ہو یا نہ ہو، لیکن خطرہ سے بچنے کی حیوانی فراست ضرور ہے، زمانہ نے مجھے دو سبق دئے ہیں، آپ بھی سن لیجئے۔ ایک یہ کہ دنیا کی بہت سی مصیبتیں خود مول لیجاتی ہیں اور دوسرے یہ کہ اگر کوئی مصیبت آجائے تو صبر و ضبط سے تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اول تو میں آپ کا مشورہ قبول ہی نہ کروں گا، اور اگر غلطی سے ایسا ہو گیا تو آپ اس کے نتیجہ سے بے خبر رہیں گے۔ پھر بتایئے کہ آپ کے لطف کی کیا صورت باقی رہی۔ مجھے تو آپ معاف ہی رکھئے۔

---

گرامی نامہ پہونچا، حیران ہوں کہ اس کے جواب میں آپ کو وہ توقع کیونکر دلاؤں، جو کسی طرح میرے بس میں نہیں ہے۔ آپ نے جو حالات لکھے ہیں وہ حد درجہ افسوسناک ہیں، لیکن میری رائے میں انکا علاج وہ نہیں ہے جو آپ نے تجویز فرمایا ہے۔ میں آپ سے زیادہ آپ کے "برادران یوسف" کو جانتا ہوں اور

اُن سے ملکر کوئی درمیانی راہ صلح و آشتی کی نکالنا بقول غالب "لانا ہے جوئے شیر کا"

میں نے پہلے ہی کہدیا تھا کہ آپ ان سے ملکر اپنے مستقبل کو تباہ نہ کیجئے، لیکن آپ نہ مانے اور آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بہر حال اب بھی کچھ نہیں گیا، ہمت نہ ہارئے، اپنا کاروبار علٰحدہ کر کے ناقوں سے انکا مقابلہ کیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ناؤ زیادہ چلنے والی نہیں۔ اس لئے یوں بھی اس کو ذریعۂ نجات سمجھنا حماقت ہے۔

اگر آپ میرے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہوں، تو میرے تمام ذرائع آپ کے لئے وقف ہیں۔ کیونکہ میرے لئے سوال صرف آپ کی ہمدردی کا نہیں بلکہ اُن سے انتقام لینے کا بھی ہے۔

---

مکرمی۔ آپ نے غالب کی شاعری پر جو کچھ تبصرہ فرمایا ہے، اس سے مجھے بڑی حد تک اتفاق ہے لیکن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس نے استعمال الفاظ میں کوئی غلطی نہیں کی یقیناً وہ لغت پر عبور رکھتا تھا وہ جانتا تھا کہ ایک لفظ کا صحیح مفہوم کیا ہے، لیکن محل استعمال میں کہیں کہیں اس نے غلطیاں کی ہیں، گو وہ ایسی نہیں کہ ہر شخص کی نگاہ ان پر پڑ سکے۔ میں نے اس سے قبل مثالاً یہ شعر آپ کو لکھا تھا:۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

اور اس پر غور کرنے کی دعوت دی تھی، لیکن آپ کے نزدیک اس میں کوئی بات محلِ نظر نہیں۔ میں سمجھتا ہوں، ہے۔

شعر کا مطلب واضح ہے، لیکن لفظ "لذت" کا استعمال میری رائے میں صحیح نہیں کیا گیا۔ غیر نے تو یہ طعن دیا تھا کہ غالب زخم سلوا رہا ہے یعنی چارہ جوئی سے اپنی تکلیف کم کرنا چاہتا ہے، اس کا جواب غالب کو یہ دینا چاہئے تھا کہ غیر کا یہ طعن درست نہیں کیونکہ زخم سوزن میں بھی کم تکلیف نہیں ہوتی، لیکن اس نے یہ کہا کہ زخم سوزن میں بھی لذت ہے۔ غیر کا طعن تو یہی تھا کہ غالب لذت و راحت کا خواہشمند ہے اور اسی کی تصدیق غالب نے بھی کردی۔

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ "کیوں صاحب مصیبت میں آپ مجھ سے جدا ہوگئے" اور آپ یہ جواب دیں کہ "کیا آپ سے جدا ہونا راحت نہیں ہے" تو وہ کیا سمجھے گا، اگر دوسرے مصرعہ کا انداز یہ ہوتا کہ "غیر زخم سوزن کو بھی شاید لذت سمجھتا ہے" تو بیشک درست ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ غالب نے لذت کہکر اذیت ہی کا مفہوم لیا ہے لیکن اپنے نقطۂ نظر سے نہ کہ غیر کے زاویۂ نگاہ سے، لیکن چونکہ جواب دینا ہے غیر کو اس لئے اسی کے نظریہ کو سامنے رکھنا چاہئے تھا۔

آپ نے پھر یاد کیا، اور میں پھر یہ محسوس کرنے لگا کہ میری زندگی میں خلوت کی کچھ گھڑیاں ہنوز باقی ہیں کہتے ہیں کہ انسان کا دل ایک مستقل دنیا ہے، لیکن جب یہ دنیا ویران ہونے پر آتی ہے تو پھر انسان کی کوئی کوشش کام نہیں آتی۔

مقدر کا قایل نہیں اور آپ پر الزام رکھوں اس کی جرأت کہاں ؟ جو کچھ ہو چکا ہے اسے یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں، ماضی و حال تو یوں ختم ہوئے، رہگیا مستقبل سو وہ ہنوز عدم میں ہے۔ اگر وہ حال بنکر سامنے آیا بھی تو یہ کیا ضرور ہے کہ اسوقت تک میری آنکھیں خشک ہو چکی ہوں۔ شاید یہی آپ سننا چاہتی تھیں، سو سن لیجئے اور اس کے بعد بھی جب کبھی آپ اس ساز کو چھیڑیں گی تو یہی آواز سنیں گی۔ میں بھی خوش ہوں کہ جو کچھ ہو رہا ہے آپ کی توقع کے خلاف نہیں ہے۔ خدا حافظ!

---

حضرت،

آپ کو خط لکھا جواب نہ ملا، آدمی بھیجا وہ بھی خالی ہاتھ واپس آیا، آپ کے خالِ معظم جاتے تھے اُن سے کہلایا، حضرت قبلہ پیر و مرشد سے لکھوایا، لیکن آپ نے ایک نہ سُنی، اب صرف یہ صورت رہگئی ہے کہ میں خود آستانۂ گرامی پر حاضر ہوں اور دربان مجھے وہاں سے ٹھکرا کر باہر کر دے، سو یہ بھی کر دیکھنا ہے، میں پرسوں رات کی گاڑی سے روانہ ہوں گا اور صبح کو ۶ بجے پہونچوں گا، مقابلہ کے لئے طیار رہئے، مہلت کافی ہے۔

---

قبلہ،

کیا عرض کروں کہ میرے اضطراب و التہاب کا کیا عالم ہے۔ ابراہیم آگ میں ڈالے گئے اور نہ جلے، یہاں چنگاری ایک نہیں لیکن از سرتا پا مشعل بنا ہوا ہوں۔ اس کی وجہ مجھ سے نہ پوچھئے کسی اور سے پوچھئے۔

آں را کہ دل ربودن و نشناختن لبے ست!

یہ داستان اتنی طویل، اس قدر جگر خراش ہے کہ نہ میں بیان کر سکتا ہوں، نہ آپ سن سکتے ہیں آپ قیاس سے کام لیکر یوں خیال فرمایئے کہ اگر پانی کو پانی سمجھ کر ہاتھ لگایا جائے اور وہ آگ نکل آئے تو آپ کیا کریں گے۔ بس بالکل یہی حالت میری ہے۔ دنیا میں سیکڑوں بار میں نے دھوکے کھائے اور ہر مرتبہ یہی سمجھا کہ بس انتہا ہو گئی۔ لیکن اس مرتبہ تو فطرتِ انسانی کا وہ پہلو میرے سامنے آیا ہے کہ بسا اوقات مجھے خیال ہوتا ہے، کہیں میں خود اپنے آپ کو تو دھوکا نہیں دے رہا۔ حقیقت یہ کہ جب انسان انسانیت ترک کر دیتا ہے تو پھر افریقہ و ایشیا کے صحرائی درندے بھی اس سے پناہ مانگنے لگتے ہیں!

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آیندہ اس ذکر کو کبھی میرے سامنے نہ چھیڑیں۔

---

خوب،

پوچھتے ہو کیا ارادہ ہے؟ اسے، وہی جو جان پر کھیل جانے والے کا ہو سکتا ہے۔ میں اُن سے ملوں گا، ضرور ملوں گا اور جو کچھ کہنا ہے برملا کہوں گا، سب کے سامنے کہوں گا۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے تھے کر چکے، اب کم سے کم جو کچھ میں کر سکتا ہوں اسے بھی دیکھ لیں۔ اگر انھوں نے خود کشی نہ کی تو اس کا سبب ان کی گراں جانی ہوگی، یہ نہ سمجھنا کہ میری طرف سے کچھ کمی ہوئی۔ اگر یہ تماشہ دیکھنا ہے تو آجاؤ تم بھی دیکھ لو کہ جی سے گزرنے والے کیا کچھ کر گزرتے ہیں!

---

مکرمی،

قاصد پہونچا، خط دیا، پڑھا، لیکن کچھ نہ سمجھ سکا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، بار بار میں اس کا منھ دیکھتا تھا کہ شاید زبانی پیام کچھ اور ہو۔ مگر وہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

اتنا تو میں نے سمجھا کہ آپ کا روئے سخن قاصد ہی کی طرف تھا، لیکن حاضری کی غرض کیا تھی، سفر کا مقصود کیا تھا، باوجود استفسار مجھے نہ معلوم ہو سکا۔ ان کی بغل میں ایک پلندہ کاغذوں کا ضرور تھا، اور ان کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شاید اسے دکھانا بھی چاہتے ہیں، لیکن نہ انھوں نے تقدیم کی، نہ میں نے اصرار۔

آپ ہی لکھئے کہ بات کیا تھی، اور اگر ان کا پتہ معلوم تو ہو اطلاع دیجئے تاکہ میں ان کو بلا کر پھر دریافت کردوں۔ میں تو عجیب اُلجھن میں پڑ گیا ہوں۔

---

# اعلان

"کلیم" کے دفتر کو چونکہ ملیح آباد تبدیل کر دیا گیا ہے اور ڈکلریشن وغیرہ کے سلسلے میں ابھی کارروائی مکمل نہیں ہو سکی ہے۔ اس لئے افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ آیندہ پرچہ مشترک مئی، جون ۱۹۳۹ء کا شایع کیا جائیگا

قارئین کرام آیندہ سے مندرجہ ذیل پتہ پر مراسلت فرمائیں

مدیر کلیم۔ دفتر کلیم۔ ملیح آباد۔ لکھنو

# باب المراسلۃ والمناظرۃ

دہلی تراہا بیرم خاں، حویلی مفتی اکرام الدین خاں مرحوم
۲۴ر اپریل سنہ ۳۹ء

بخدمت حضرت نیاز احمد صاحب نیاز فتحپوری

نوائے عندلیب اے دل تجھے خوش آئے کیوں — خوش آئے شورش مرغان ہرزہ گو ساری ! (حافظ)

واہ حضرت واہ ! خوب ریویو ترجمۂ دیوان حافظ پر فرمایا ؟ بار احسان نے مترجم کو معہ ترجمہ دفن ہی کر دیا ہوتا اگر خاک ڈالے سے خاک پڑ جاتی !

یہ نصیحت آپ کی کہ راقم اگر کسی اور شغل میں یہ وقت (جو ترجمے کو دیا) صرف کرتا تو بہتر تھا، از راہ دردمندی ہی سہی مگر مشتے بعد از جنگ ہے اور اُس کا استعمال معلوم !

اس نصیحت پُر فضیحت کے بعد کے فقرات نے تو ریویو گری کی ٹانگ ہی توڑ دی فرماتے ہیں :- "اول تو دیوان حافظ کو ترجمے سے سمجھنا ہی کچھ معنی نہیں رکھتا۔ نہ کہ منظوم ترجمے سے جس میں اہمال اور بھی بڑھ جاتا ہے۔"

جناب کا فرمانا محض بجا و درست اس لئے کہ جناب کا فرمانا ہے ورنہ :-

جن کو فارسی نہیں آتی وہ اگر حافظ کو ترجمے سے نہ سمجھیں تو اور کونسا رستہ اُن کے لئے کھلا ہوا ہے ؟ الہام کا ؟ اُس کے شاید آپ قایل نہیں اور جو قایل ہیں اُن کے نزدیک بھی اُس کا دروازہ تیرہ سو برس سے زیادہ ہوئے کہ بند ہو چکا۔

یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ ترجمہ سے نہ سمجھ سکنے کی قید صرف حافظ کے ساتھ آپ نے کیوں لگائی اگر یہی ہے تو پھر حافظ کیا کسی کلام کو بھی ترجمے سے سمجھنا بقول آپ کے "کچھ معنی نہیں رکھتا"، مگر اس کا کیا جواب کہ آج غیر زبانوں کے علوم و فنون و ادبیات سب ترجمہ ہی کے ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ بس ترجمہ سے سمجھنا جسے آپ نے لکھا ہے کہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔ بہت کچھ معنی رکھتا ہے البتہ آپ کا فرمانا گوز شتر نکلا۔ اُس کے کچھ معنی ظاہر نہ ہوئے۔

منظوم ترجمہ سے اہمال اور بڑھ جانا، یہ کلیہ بھی جناب نے عجیب و غریب تراشا اس سے یہ تسلیم کرنا لازم آیا کہ جو چیزیں نظم میں ترجمہ ہوتی ہیں ان میں اہمال بڑھ جاتا ہے مثلاً شاہنامہ کہ جب فردوسی نے اُس کے دفتروں کو نظم کیا تو اہمال کے دفتر

بھر گئے یا فٹز جرالڈ نے رباعیات خیام کو منظوم کیا اور ونفیلڈ نے تقریباً تمام رباعیات کو منظوم کر ڈالا تو آپ کے نزدیک دونوں نے علاوہ اس کے کہ اپنا وقت ضایع کیا۔ اور اہمال بڑھا دیا؟ کیا آپ کی اس رائے کو مان لیا جائے؟ اگر آپ کی خاطر سے مان لیا جائے تو دنیا کیسے مان لیگی؟۔ ترجموں میں اہمال بڑھ جانے یا پڑ جانے کے امکان سے ناظرین کو یہ متبادر کرانا کہ زیر نظر ترجمہ بھی اہمالات سے پُر ہوگا، نگارانہ دیانتداری کے خلاف ہے، لامذہبوں کا بھی ایمان دیانتداری ہوتا ہے آپ تو مسلمان ہونے کی بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ترجمۂ حافظ کی یہ اُچٹتی ہوئی کاٹ کرنے میں آپ نے اپنے دین و مسلک پر بھی قلم پھیر دیا۔ غالباً اُسوقت آپ کا قلم کچھ روشنائی زیادہ پی گیا تھا۔ اب سنئے۔ مترجم کو یہ زعم ہے کہ تخمیناً پانچہزار اشعار کے منظوم ترجمے میں دو فیصدی اشعار بھی آپ ایسے نہیں بتا سکتے جو اہمال سے بری اور صاف نہ ہوں۔ یہ وصف اُس کا آپ کو بھی تسلیم کہ بحر و قافیہ اول سے آخر تک اصل سے مطابق اور ردیف بھی ہم آواز۔ اس سے نتیجہ یہ خود بخود مترتب ہوتا ہے کہ ترجموں میں یہ ترجمہ بے مثل و لاجواب ہے۔ لہذا مترجم نے کچھ تضیع اوقات نہیں کی اگر ایسی چیز جس کی اصل بھی دنیا ہے شعر و ادب میں لاجواب مانی جاتی ہے اُردو میں پیش کرنے کی کوشش کی ؂

فریاد حافظ ایسی تو کچھ بے مزہ نہیں ایک قصۂ غریب و حکایت عجیب ہے

آپنے اپنے ریویو میں جسے سیکڑوں ہزاروں آدمی پڑھتے ہیں خاصے اچھے ترجمے کو اہمالات کی پوٹ متبادر کرا کر ترجمہ کی اشاعت کو وہ نقصان پہونچایا جو کسی بدفطرت خبیث کا کام ہونا چاہیے تھا نہ کہ آپ کا۔ انسانیت اور دیانت کا اقتضا یہ ہے کہ اپنے لکھنے کی آیندہ اشاعت میں تردید کریں۔ اگر آپ سے خود اپنی ناک نہ کاٹی جاسکے یعنی اپنے قلم سے اپنی تردید آپ نہ کرسکیں تو اس مراسلہ کو بجنسہ اپنے رسالہ میں شایع کردیں اور اس کے جواب میں لکھیں جو لکھ سکتے ہوں۔

مدعی جائے الہو۔ اُلجھے نہ حافظ سے کبھی ورنہ اُس کا بھی قلم نوک و زباں رکھتا ہے

ایک دو سطر کے ریویو میں کتنے دھکّے آپ کی عقل و فہم نے کھائے اگر کچھ طول کلام فرماتے تو کہاں سے کہاں تک قلابازیاں کھاتے ہوئے جاتے!۔ اڈیٹر کے قلم کو گنوار کا لٹھ نہ ہونا چاہئے۔ ایک کُلیہ خود ہی گھڑ کر اُسکے تحت ترجمہ کو رکھ دینا ستم ظریفی ہے نکتہ چینی ہے نہ تنقید، شبدیز قلم کو ٹھیراتے اور ٹھنڈے دل سے غور فرماتے تو سارے ترجمہ کو ایک لکڑی نہ ہانک جاتے بلکہ اصل کے اس دعوے کا کہ:۔

حافظ کی نظم سب کو پلاتی ہے آب لطف دشمن کی نکتہ چینی نے دم کب یہاں لیا

کچھ حصہ مترجم کو بھی عطا فرماتے۔ مگر شرم آتی ہے اس خیال سے کہ خدا نے ہمیں کس سوسائٹی میں پیدا کیا جہاں کے بڑے سے بڑے چوٹی کے نقاد خوبیاں چرانے کی خاصیت رکھتے ہیں۔ یا شاید گومتی کے پانی کا اثر ہوگا جس کی وجہ سے ایک غریب دہلوی کی کوشش نظروں میں نہ سمائی اور بڑی روشنی اُس پر ڈالدی گئی خیر ؂ دشمن برائیاں مری حافظ کیا کرے احسان اُس خدا کا نہیں شر مسار دوست۔ فقط

والسلام خیر الکلام خاکسار احتشام الدین (ام - اے) علیگ

(نگار) مجھے افسوس ہے کہ جناب کو میرے تبصرہ سے تکلیف پہونچی اور اگر معذرت پیش کرنے کی کوئی ضعیف ترین

وجہ بھی موجود ہوتی تو باور فرمائیے میں طلب عفو کرکے آپ کی اس تکلیف کو دور کرنے کی پوری کوشش کرتا۔ لیکن کیا عرض کروں، آپ نے اپنے ترجمہ میں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ اور اب آپ کی اس تحریر نے تو اور بھی قیامت کردی کہ خواہ مخواہ ایک بھولی ہوئی بات یاد دلادی اور مجھے مجبور کیا کہ زیادہ تفصیل کے ساتھ آپ کے ترجمہ کے محاسن پیش کردوں۔

دیوان حافظ لفظی و معنوی حیثیت سے کوئی ایسی مشکل چیز نہیں کہ اس کے سمجھانے کے لئے ترجمہ و تفسیر کی ضرورت ہو۔ مبتدی اس کو دیکھتا نہیں اور منتہی کے لئے اس میں کوئی اشکال نہیں۔ اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ کلام حافظ کو ترجمہ سے سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

یہ بالکل درست ہے کہ علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن دیوان حافظ کوئی فنی کتاب تو نہیں کہ اس کے غوامض و دقایق بغیر ترجمہ کے سمجھ میں نہ آسکیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک شعر کے محاسن کا تعلق زیادہ تر احساس انسانی سے ہوتا ہے اور سب سے بہتر شعر وہ ہے جس کا لطف بیان نہ ہوسکے بلکہ صرف محسوس کیا جائے اس لئے آپ تو نظم کہتے ہیں، میرے نزدیک کسی اچھے شعر کا ترجمہ نثر میں بھی کرنا شعر و شاعر دونوں پر ظلم کرنا ہے۔

آپ نے اس سلسلہ میں خواہ مخواہ فردوسی و شاہنامہ کا ذکر کیا کیونکہ فردوسی شاہنامہ کا مصنف ہے اور آپ دیوان حافظ کے مترجم ہیں، رہگیا خیام اور فٹز جرالڈ کا معاملہ، سو اس کی بابت سوائے اس کے کیا عرض کروں کہ وہ خیام کی قسمت تھی کہ اسے فٹز جرالڈ ایسا مترجم نصیب ہوگیا اور یہ حافظ کا مقدر ہے کہ اس کو مترجم آپ ملے۔ علاوہ اس کے یوں بھی حقیقتاً فٹز جرالڈ نے رباعیات خیام کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے اور اس لئے اس کی حیثیت ایک علیحدہ تصنیف کی سی ہوگئی، لیکن آپ نے تو یہ غضب کیا کہ بحر و قافیہ کی پابندی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کا ترجمہ خدا جانے کیا چیز ہوکر رہگیا۔

آپ کی محنت و کاوش سے انکار نہیں ہوسکتا، لیکن معاف کیجئے بہ لحاظ نتیجہ اسکی حیثیت "کوہ کندن و کاہ برآوردن" سے زیادہ نہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "ترجمے میں جہاں کوئی مشکل آن پڑی حضرت کی روحانیت کی طرف توجہ کرنے سے حل ہوگئی"، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ لسان الغیب کی روحانیت بھی اس باب میں کام نہ آئی اور جتنی غلطیاں شعر و شاعری میں ہوسکتی ہیں وہ بفضلہ سب آپ کے ترجمہ میں موجود ہیں، تعقید و ایطا، کو چھوڑئے آپ نے تو وزن شاعری کا بھی کہیں کہیں لحاظ نہیں کیا اور مفہوم کی جتنی مٹی پلید کی ہے اس کی داد تو آپ کو صرف حافظ شیرازہی سے ملسکتی ہے۔

یہ حقیقت اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ کلام حافظ کے ساتھ لوگوں کی متصوفانہ ارادت سخت جاہلانہ حرکت ہے اور اس جذبۂ غیر معقول نے حافظ کے کلام کا مرتبہ کس حد تک گرا دیا ہے۔

چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس نے آپ کو اس طرف متوجہ کیا اور آخر کار دیوان حافظ کو ایک مجموعۂ مزخرفات ثابت کئے بغیر آپ کو چین نہ آیا۔ یقیناً یہ سنکر آپ اور زیادہ برہم ہوں گے، لیکن آپ کی یہ برہمی مجھے گوارا ہی بجائے اس کے کہ میں آپ کو اس مغالطہ میں مبتلا رکھوں کہ واقعی آپ سے بہتر مترجم حافظ کو کوئی نہ مل سکتا تھا اور اس طرح آپ کل کسی اور شاعر پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

میں نے آپ کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نہایت احتیاط و مروت سے کام لیا تھا اور آپ کے ترجمہ کا نمونہ قارئین نگار کے سامنے پیش نہ کیا تھا لیکن اب میں مجبور ہوں کہ چند مثالیں آپ کے ترجمہ کی پیش کروں، اور اسکے حسن و قبح کا فیصلہ دنیا پر چھوڑ دوں۔

دیوان حافظ کا سب سے پہلا مصرعہ ہے:- "الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا"

آپ اس کا ترجمہ فرماتے ہیں:- "سن اے ساقی چلا ساغر وے آنا سہل تھا دل کا"

اس "چلا ساغر وے آنا" کی داد کیا دیجا سکتی ہے۔ آپ اگر چاہتے تو اس مصرعہ کو یوں لکھ سکتے تھے:-

"چلے اب، ساقیا ساغر کہ آنا سہل تھا دل کا"، لیکن شاید اس طرح ضغطۂ تصوف نہ پیدا ہوتا۔

اسی غزل کا دوسرا شعر ہے:-

بوئے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید | زتاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

آپ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:-

جو بوئے نافہ طرہ سے صبا پچھلے کو کھول آئے | بھرے بل زلف مشکیں پیچ کیا کیا کھائے خوں دل کا

ایسا تو نہیں کہ حافظ نے آپ کے شعر کا ناکام ترجمہ کیا ہو!

اور اس غزل کے مقطع[1] کا ترجمہ کرنے میں تو آپ نے کمال ہی کر دکھایا!

حضوری چاہے گر حافظ تو رکھ پیش نظر اس کو | اُسے دیکھے تو دنیا چھوڑ دے یہ پھینکدے چھلکا

---

میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں ہر قسم کی غلطی کی مثال یہاں پیش کروں لیکن اگر آپ نے اصرار فرمایا تو

---

[1] حافظ کا مقطع یہ ہے:-

حضوری گر ہمی خواہی ازو غائب مشو حافظ | متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا

مجبوراً آپ کی خاطر سے مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔ اسوقت تو بغیر مقصد وارادہ کے صرف اُن چند اشعار کا ترجمہ پیش کرتا ہوں جو بہت مشہور ہیں:۔

صلاح کار کہاں یہ دل خراب کہاں ۔۔۔ ہے فرق وفاصلہ ان میں کہاں سے تابہ کہاں

تابہ کہاں کی داد کون دے سکتا ہے۔

سنبھال لے ترک شیرازی بھرے یہ دل نے یوں مارا ۔۔۔ سمرقند وبخارا خالِ کافریہ ترے وارا

پہلے مصرعہ کا حسن بندش کیا کہنا، لیکن تحریف مفہوم اس سے زیادہ قابل ستایش ہے!

دیا دشنام، میٹھا کر دیا مُنھ واہ کیا کہنا ۔۔۔ جواب تلخ ان ہونٹوں سے ہے لب ہیں یا شکر پارا

حقیقتاً ترجمہ کی خوبی یہی ہے کہ اصل شعر سے بھی انسان کو نفرت ہوجائے۔

رو بہ میخانہ نکل مسجد سے آیا پیر ہے ۔۔۔ اب اے یارانِ طریقت اپنی کیا تدبیر ہے

پہلے مصرعہ کا حسن اس طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتا کہ دوسرے مصرعہ میں "اے" کہاں جارہا ہے لیکن اس سے زیادہ بے مثل اشعار یہ ہوئے ہیں:۔

سجدہ سوئے کعبہ کیونکر کر سکیں گے ہم مُرید ۔۔۔ قبلہ میخانہ کو پکڑے اپنا قبلہ پیر ہے
دام دل میں ہو گئی تھی جمع خاطر ایک شکار ۔۔۔ زلف جاناں کھل پڑی آہو ہوا نخچیر ہے

دوسرا شعر تو ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کوئی پہیلی بجھا رہے ہیں۔

مقطع اس کا بھی لاجواب ہوا ہے:۔

ہم بھی حافظ ڈال دیں چوکھٹ کے باہر بسترا ۔۔۔ ہم نشیں رندوں کا اندریار اپنا پیر ہے

یہ "رندوں کا اندریار" سبحان اللہ، کیا کہنا!

میں کہاں تک انتخاب کروں اور کس کس خوبی کی داد دوں۔ "بسیار شیوہاست بتاں راکہ نام نیست!" لیکن کچھ اور سن لیجئے:۔

ہمدوشِ صبا نافۂ تاتار رسیدہ ۔۔۔ یا کہئے کہ خود اس کی گلی سے ہیں پریدہ
کھلی نہیں کرتا ہے اگر غنچہ لبوں سے ۔۔۔ منھ کس کا چڑاتا ہے وہ یوں ہونٹ دریدہ
کب تک یہ ترے وعدے کہ آتا ہوں، اب آیا ۔۔۔ آجک کہ نہ پھر سیاہ پڑے پھر کے سپیدہ
ٹک بلبل نے کیا ایک دن جو گل تازہ شگفت ۔۔۔ تجھ سے گلشن میں بہت پھولے ہیں اترا تو نہ مفت
گل نے ہنس کر کہا سچ بات کا کیا رنج و لے ۔۔۔ کسی عاشق کو بھی معشوق سے یہ تلخ تھی گفت
گر ہوس جام مرصع میں ہے مئے لعل کی ہو ۔۔۔ چاہئے نوک مژہ سے در و یاقوت ہوں سفت
تا ابد بو بھی محبت کی نہ سونگھی جس نے ۔۔۔ روب کی پنجہ مژگاں سے نہ میخانوں میں رُفت

رازِ الفت تو زباں پر ہی نہیں آسکتا ساقیا جام دے، رکھ طاق پہ سب قال و گفت
ہوش و صبر اشکوں نے حافظ کے کئے غرقاب کیسے اب سوزِ غمِ عشق چھپے یا ہو نہفت

آپ کے ان اشعار کو دیکھ کر مجھے وہ روایتیں یاد آگئیں جو پرانے زمانوں کے کایستھوں کی فارسی دانی کے متعلق بیان کی جاتی ہیں ایک شعر یاد آگیا سُن لیجئے :-

خشک سے بھئی بند طاؤسنی جب بہن لاگے قصرن میں پانے کے ریلا

طاؤسنی - فارسی ہے موری کی اور قصرن جمع ہے قصر کی۔ آپ کی شاعری اس سے اگر ممتاز ہے تو صرف اس حیثیت سے کہ اس قسم کے روایتی اشعار دس پانچ سے زیادہ نہیں اور آپ کے یہاں پورے ۳۳۲ صفحات پر یہ چمن کھلا ہوا نظر آتا ہے ۔ اب میں تھوڑا سا اقتباس ایسا بھی پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں آپ کے ترجمہ کے ساتھ حافظ کے اشعار بھی ہوں اور لوگوں کو آپ کی کاوش فکر کی داد دینے کا موقعہ ملے۔

حافظ :- آپ :-

بمژگانِ سیہ کردی ہزاراں رخنہ در دینم ہزاروں رخنے مژگانِ سیہ نے کر دئے دیں میں
بیا کز چشمِ بیمارت ہزاراں درد برچینم اِدھر لا درد میں کیا کیا علیل سرمہ آگیں میں

چشمِ بیمار کا ترجمہ "علیل سرمہ آگیں" کرنا حقیقت یہ ہے کہ بجز الہام کے اور کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند نصیحت مان لے پیارے کہا دانا بزرگوں کا
جوانانِ سعادتمند پندِ پیرِ دانا را سعادتمند جواں رکھتے ہیں جی اور جان سے پیارا

تعقید و اہمال تو خیر آپ کے ترجمہ کی خصوصیت خاصہ ہو لیکن اس شعر میں آپ نے سعادتمند کی دال کو کھا جانے میں غالباً خاص کاوش سے کام لیا ہے۔

شب از مطرب، کہ دل خوش باد وے را خدا خوش رکھے شب مطرب سنے چیکا
شنیدم نالۂ جانسوز نے را دیا ایک نالۂ جانسوز نے کا

اے ہدہد صبا بہ سبا می فرستمت ہُد ہُد بن اے صبا کہ سبا بھیجتا ہوں میں،
بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت تو دیکھ تو کہاں سے کجا بھیجتا ہوں میں

افسوس ہے کہ نگار میں گنجایش کم ہے ورنہ آپ کے ترجمہ میں ان ادبی لطائف کی کمی نہیں۔ اگر آپ نے اصرار فرمایا تو پھر کسی صحبت میں اس فرض کو ادا کروں گا، کیونکہ آپ کا یہ شاہکار ہر وقت میری میز پر رہتا ہے اور جب میں تھک جاتا ہوں تو اکثر و بیشتر اس کے مطالعہ سے دماغی خستگی دور کر لیا کرتا ہوں۔

# مطالعۂ فطرت

## (دوسرا سبق)

### ہمارا کرۂ زمین اور آثارِ حیات

کائنات میں چاہے کتنے ہی بڑے بڑے کُرے کیوں نہ پائے جائیں لیکن ہم کو جتنی محبت اپنے کرۂ زمین سے ہوسکتی ہے، کسی سے نہیں، کیونکہ ہم اسی سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی میں ہم کو مرنا جینا ہے، اسی لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے حالات سے بخوبی واقف ہوں۔

یہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ زمین کا اندرونی حصہ بہت گرم ہے اور اس کا ثبوت جوالامکھی پہاڑوں سے ملتا ہے لیکن اس کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہوتی جارہی ہے۔ ہم جتنا زیادہ زمین کے اندر جائیں گے اتنی ہی زیادہ گرمی معلوم ہوگی، چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر ۶۶ فٹ پر ایک ڈگری گرمی بڑھجاتی ہے، اسی لئے گہری معدنوں کے اندر جو لوگ کام کرتے ہیں ان کو ٹھنڈک پہونچانے کے لئے خاص انتظامات کئے جاتے ہیں۔

اگر ہم زمین کے اندر سوراخ کرتے چلے جائیں تو اس کے قلب تک پہونچنے میں ہم کو چار ہزار میل کا سوراخ کرنا پڑے گا اور یہ حصہ اتنا گرم ہوگا کہ ہر چیز یہاں پگھلی ہوئی نظر آئے گی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین کسی وقت ساری کی ساری دہکتے ہوئے انگارے کی طرح ہوگی اور پھر رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہوتے ہوتے اس حالت میں پہونچی۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ ایک سیب جب خشک ہوجاتا ہے تو اُس پر جھریاں سی پڑجاتی ہیں بالکل یہی حال زمین کا بھی ہے کہ جب وہ سکڑنے لگی تو اس پر جھریاں سی نمودار ہوئیں جن کو ہم پہاڑ کہہ سکتے ہیں، لیکن چونکہ پہلے بالکل مشتعل گیسی حالت تھی اس لئے ہوا کے دباؤ سے وہ گیس پانی بھی بنتی گئی اور اس طرح سمندر اور خشکی کا وجود دنیا میں آیا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہ تھے کہ اسی وقت جاندار بھی یہاں پیدا ہوگیا۔ اس کی صلاحیت زمین میں بہت دنوں کے بعد پیدا ہوئی اور آج ہم اسی کو بیان کریں گے کیونکہ زمین کی تاریخ کا سب سے زیادہ دلچسپ ٹکڑا یہی ہے

سوائے قطبین کے جہاں غیر معمولی ٹھٹھرا دینے والی سردی پائی جاتی ہے زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں کوئی جاندار نہ پایا جاتا ہو، یہاں تک کہ زمین کے بیرونی سطح کے نیچے بھی کچھ دور تک زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے لیکر سمندر کی گہرائیوں تک ہر جگہ جاندار نظر آتے ہیں اور اس قدر کثرت سے کہ اگر ہم ان کا علم حاصل ہو جائے تو ہم حیران رہجائیں۔

## زندگی کی حقیقت

زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے شروع سے اسوقت تک لوگوں نے کیا کیا چھان بین کی اور کیا کیا نظرئے اس باب میں قائم کئے، اس کا بیان بہت تفصیل چاہتا ہے، علاوہ اس کے وہ اتنا الجھا ہوا ہے کہ ہمارے ابتدائی سبقوں کے لحاظ سے ان کا ذکر مناسب نہیں، تاہم اتنا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ تازہ ترین نظریہ زندگی کے وجود کی بابت یہ ہے کہ اس کا اصل سبب بیکٹیریوفیج ( Bacteriophage ) ہے جسے بیکٹیریم ایٹر ( Bacterium eater ) یا جرثومہ خوار بھی کہتے ہیں۔ یہ اتنا حقیر وجود ہے کہ ایک ذرہ کا لاکھواں حصہ بھی اس سے بڑا ہے اور قوی سے قوی خوردبین بھی اس کو نہیں دیکھ سکتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ آج تک کسی خوردبین سے بھی نہیں دیکھا گیا تو اس کے وجود کے ماننے کی کیا ضرورت ہے، لیکن نہیں تجربہ بتاتا ہے کہ ہمیں اس کا ماننا ضروری ہے اگر کسی بیماری سے کسی کی زبان یا منھ میں چھالا پڑ جائے تو آپ اس کے پانی کو جدید ذرائع سے اس طرح چھان سکتے ہیں کہ خوردبین سے پھر کوئی چیز اس کے اندر نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر آپ اسی چھنے ہوئے مادہ کو کسی دوسرے کے جسم میں پہونچا دیں گے تو اس میں بھی وہی بیماری پیدا ہو جائے گی، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اس چھنے ہوئے پانی میں ضرور کوئی چیز ایسی پائی جاتی تھی جس نے اپنا اثر کیا اور اس لئے خوردبین سے کسی چیز کا نظر نہ آنا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ چیز موجود نہیں ہے۔ ہر چند اسوقت بڑی بڑی قوی دوربینیں طیار ہو گئی ہیں لیکن پھر بھی اتنے دقیق ذرات حیات کائنات میں پائے جاتے ہیں کہ انکا مشاہدہ ممکن نہیں، ہاں، تو کہا جاتا ہے کہ زندگی کا اصل سبب جرثومہ خوار ہے جو دوسرے جراثیم کو اپنی غذا بنا کر بڑھتا رہتا ہے۔

سائنس داں اس بات میں مختلف الخیال ہیں کہ اس جرثومہ خوار کی حقیقت کیا ہے۔ ہر چند خود اس کے وجود کا اسوقت تک پتہ نہیں چلتا جب تک وہ جراثیم سے ٹکرائے نہیں، تاہم اسکو ہم مردہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ بیجان چیز خود کسی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور اس کا فعل واثر کھلا ہوا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور بہت زیادہ دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ زندگی کا آغاز کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے تو پھر اسے جاری کون رکھتا ہے اور اس میں تغیرات کیوں ہوتے رہتے ہیں

اگر حیات کی ابتدا، جراثیم ہی سے ہوئی تھی تو پھر جراثیم ہی ان کو رہنا چاہئے تھا، کائنات کے یہ تمام تنوعات حیات کیونکر وجود میں آئے؟ - اس کے علاوہ یہ بھی کہ اگر زندگی میں یہ تنوع پیدا بھی ہوا تو ایسا کیوں ہے کہ آلو کے درخت سے ہمیشہ آلو ہی پیدا ہوتا ہے، شیر ہمیشہ گوشت ہی کھاتا ہے، گائے نباتات ہی کو پسند کرتی ہے، مجھے گانا بھاتا ہے اور آپ کو نہیں۔ اس کا جواب بعض مفکرین نے یہ دیا ہے کہ اس کا تعلق (Life Force) یعنی زندگی کی قوت فعال سے ہے، لیکن ایک سائنس داں ان اصطلاحات کو نہیں سمجھتا وہ ایسی باتوں کو زبانی جمع خرچ جانتا ہے۔ وہ تو واقعات و تجربات سے بحث کرتا ہے اور انھیں سے کسی نتیجہ تک پہونچنا پسند کرتا ہے۔ اسی چھان بین کا نتیجہ نظریۂ ارتقاء (Evolution) ہے جن کا شمار اب حقایق میں ہونے لگا ہے۔

## نظریۂ ارتقاء

نظریۂ ارتقاء کا موجد ڈارون سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اس سے بہت پہلے یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ عیسوی عہد سے صدیوں پہلے کائنات کی پیدائش کا جو تصور انھوں نے قایم کیا تھا وہ یہ نہ تھا کہ تمام موجودات جوں کی توں ظاہر ہو گئی ہیں بلکہ تدریجی طور سے انکا وجود میں آنا مانتے تھے۔

پندرھویں صدی میں لیونارڈو ڈاونسی (Leonardo Da Vinci) نے ظاہر کیا کہ زمین کے اندر سے جو متحجر ڈھانچے (Fossils) نکلتے ہیں وہ ان جانوروں کے ہیں جو زمانۂ قدیم میں پائے جاتے تھے اور اس زمانہ کے حیوانات سے بہت مختلف تھے۔

لیونارڈو سے تقریباً تین صدی بعد لامارک، فرانس کے مشہور عالم حیوانات نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ایک حیوان کی فطری یا تناسلی خصوصیات اس کے بچوں میں ضرور منتقل ہوتی ہیں لیکن انفرادی طور پر ماحول کے اثرات سے ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے، چنانچہ ثبوت میں اس نے وھیل مچھلی کو پیش کیا، جس کے پچھلے دو پاؤں رفتہ رفتہ چھوٹے ہوتے گئے، یہاں تک کہ اب وہ بالکل غائب ہیں۔ لامارک کا دعویٰ یہ تھا کہ جن اعضاء سے کام نہیں لیا جاتا وہ ایک زمانہ کے بعد معدوم ہو جاتے ہیں اور اس طرح نسل کی نسل میں تغیر ہو جاتا ہے۔

ڈارون کی شہرت کا سبب یہ ہوا کہ اس نے اس نظریہ کو بہت زیادہ تیقن کے ساتھ پیش کیا اور بقاء اصلح (Survival of the fittest) اور انتخاب طبیعی (Natural Selections) کے نظرئے پیش کر کے اسکو علمی حیثیت دیدی۔

اس نے صرف نظریہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس جیتی جاگتی دنیا میں اس کے بہت سے ثبوت سامنے کر دئے جن سے انکار ممکن نہ تھا۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر ایک علحدہ مفصل مضمون کی ضرورت ہے جس کو ہم پھر کبھی لکھیں گے فی الحال مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ اس کا مدعا یہ ظاہر کرنا تھا کہ:-

کسی ایک ہی نوع کے افراد بہت سی چیزوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور جب یہ اختلاف انکے ماحول اور ضروریات کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتا ہے، اسی وقت وہ قایم رہتے ہیں۔ یہ تغیر حالات کے لحاظ سے برابر عمل پذیر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک ہی نسل کے افراد ایک زمانہ کے بعد ایک دوسرے سے بالکل جدا معلوم ہونے لگتے ہیں۔

قدیم ترین متحجر ڈھانچا ایک ایسے چھوٹے سے جانور کا دستیاب ہوا ہے جس کے پاؤں میں چار اُنگلیاں ہیں اس کے بعد کا ڈھانچہ وہ ہے جس میں صرف تین اُنگلیاں ہیں لیکن جانور کی جسامت بڑھ گئی ہے۔ پھر اس کے بعد کے ڈھانچہ وہ ہے جسے ہم موجودہ گھوڑا کہتے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اول اول گھوڑا دلدلی زمین میں رہتا تھا جس کے لئے اس کے پاؤں میں بطخ کی سی اُنگلیوں کی ضرورت رہی ہوگی، لیکن بعد کو جب زمین خشک ہوتی گئی تو وہ اُنگلیاں بھی بیکار ہوتی گئیں، یہاں تک کہ جب زمین زیادہ سخت ہوگئی تو بجائے اُنگلیوں کے سُم کی ضرورت ہوئی اور وہ پیدا ہوگیا۔ لیکن اگر آپ گھوڑے کا پاؤں اُٹھا کر دیکھیں گے تو آپ کو سُم کے پہلو میں اور نیچے وہ نشانات ملیں گے جہاں پہلے اُنگلیاں پائی جاتی تھیں۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی مثالیں ڈارون نے پیش کرکے ثابت کیا ہے کہ موجوداتِ عالم تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہیں اور یہ عمل رہتی دُنیا تک برابر جاری رہے گا، یہانتک کہ ایک زمانہ آئے گا جب موجودہ انسان کی صورت و شکل بھی یہ نہ ہوگی اور اس میں بہت کچھ تغیر ہوجائے گا۔ چنانچہ ایک ماہر سائنس نے پیشین گوئی کی ہے کہ انسان کا دماغی فعل چونکہ بہت بڑھتا جارہا ہے اور مشینوں کی وجہ سے ہاتھ پاؤں کا کام کم ہوتا جاتا ہے اس لئے کسی وقت انسان کی صورت یہ ہوگی کہ اس کا سر تو بہت بڑا ہوجائے گا، اور ہاتھ پاؤں بہت چھوٹے چھوٹے ہوا کریں گے معدہ اور امعاء وغیرہ بھی معدوم ہوجائیں گے، کیونکہ کیمیائی غذاؤں کی وجہ سے ان اعضاء کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ غذا کے لئے صرف شیشی کھول کر کسی مرکب کو سونگھ لینا زندگی کے لئے کافی سمجھا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے اہل مذہب کو بہت برافروختہ کیا، کیونکہ وہ تعلیمات مذہب کے بالکل خلاف تھا اور تخلیق آدم کی جو صورت الہامی کتابوں نے پیش کی تھی وہ اس نظریہ سے مردود قرار پاتی تھی، لیکن علم کی روشنی ایکبار نمودار ہونے کے بعد بجھتی نہیں، آخر کار آہستہ آہستہ سب نے نظریۂ ارتقاء کو تسلیم کیا اور اسی پر تمام موجودہ تحقیقات کا انحصار ہے۔


## فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔

اصل قیمت عہ ر رعایتی ۱۲ ار محصول علاوہ — منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

# کیا آپ کو معلوم ہے

## دُنیا میں کیسے کیسے عجیب و غریب کلب پائے جاتے ہیں

ہندوستان میں کلب کی زندگی بہت محدود ہے۔ اول تو یہاں اس قسم کے اجتماعی ادارے بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بہت سادہ قسم کے ہیں اور سوائے چند مخصوص آدمیوں کے ان میں کوئی حصہ نہیں لیتا۔ یہاں کی بڑی کائنات صرف کرکٹ کلب یا ٹینس کلب ہیں، ان کے علاوہ کسی اور قسم کے کلب اگر یہاں ہیں بھی تو بہت کم اور اُن میں کوئی جدت و ندرت نہیں پائی جاتی، برخلاف اس کے مغربی ممالک اور خصوصیت کے ساتھ امریکہ میں نہ صرف یہ کہ کلب کثرت سے پائے جاتے ہیں بلکہ اپنے مقاصد کے لحاظ سے بھی نہایت عجیب و غریب ہیں۔

برطانیہ میں ایک کلب کا نام "۲۵" ہے۔ اس کے ممبر اخبارات کے صرف وہ نامہ نگار ہو سکتے ہیں جنھوں نے ۲۵ ٹسٹ میچوں کی رپورٹ دی ہے۔ اس کلب کے ممبروں کی ٹائی متعدد رنگ رکھتی ہے جس سے ممبر کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک اور کلب ہے جس کا نام (Caterpillar Club) ہے اور اس میں صرف وہ لوگ شریک ہو سکتے ہیں، جو ہوائی جہاز سے جان پر کھیل کر چھتریوں کے ذریعہ سے زمین پر اُترتے ہیں۔ اس کلب کا نہ کوئی چندہ ہے نہ جلسہ منعقد ہوتا ہے، اس کے ممبر ایک چھوٹی سی طلائی پن اپنی ٹائی پر لگاتے ہیں جو تتلی کی شکل کی ہوتی ہے اور جسے چھتری ساز کارخانے فراہم کرتے ہیں۔ اس کا پریسیڈنٹ وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ جانبازی کے ساتھ اُترتا ہے چنانچہ ایک زمانہ میں کرنل ہنڈنبرگ اس کا پریسیڈنٹ تھا لیکن بعد کو جب امریکہ کا ایک میجر جنرل اُٹھنے والے ہوائی جہاز سے صحیح و سلامت نیچے اُتر آیا تو صدارت اس کو ملگئی۔ یہ کلب گویا ان لوگوں کا ہے جو موت کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن ایک کلب ایسا بھی ہوا ہے جو موت کو دعوت دیتا تھا۔ اسے امریکہ میں بیسویں صدی کے آغاز میں اسٹیونس نے قایم کیا تھا اس کا نام "خودکشی کرنے والوں کا کلب" تھا۔ اس کلب کا مفصل حال تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا لیکن اجمالاً یہ علم سب کو تھا کہ اس کے ممبران سال میں دو بار ذریعہ قرعہ اندازی اس کا فیصلہ کرتے تھے کہ اب کون ممبر خودکشی کرے گا، نتیجہ یہ ہوا کہ سات سال کے اندر تمام ممبران ختم ہوگئے اور کلب بھی فنا ہوگیا۔

نو سال اُس طرف کی بات ہے کہ جگوسلیویا کی پولیس نے ایک ایسے زنانہ کلب کا سراغ لگایا جس کے ممبروں کا تنہا مقصد اپنے شوہروں کو زہر دینا تھا۔ اس کلب کی عورتیں اپنے آپ کو "مقدس لوکریٹ" کہا کرتی تھیں۔

---

سلہ یہ ایک کیڑا ہے جو درختوں کی پتیاں کھاتا ہے اسے کملا کہتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ تتلی کے معنے میں مستعمل ہے۔

(لوکریٹ رومہ کی بہت مشہور عورت تھی)۔ اس کلب کی عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر غور کرتیں کہ کن تدبیروں سے اور کس قسم کے زہروں سے شوہروں کو ہلاک کرنا چاہیے۔

چند سال ہوئے ہل کی ناکتخدا لڑکیوں نے ایک کلب قایم کیا جس کا مقصود شادی نہ کرنا تھا، یہ مردوں سے متنفر تو نہ تھیں، لیکن وہ اپنی آزادی کو قایم رکھنا چاہتی تھیں اور اس لئے شادی سے متنفر تھیں اس کلب کا نام "Never Never Club" تھا لیکن ان سب سے زیادہ مفید آکسفورڈ کا (White feather Club) ہے، جس کا ممبر اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ کبھی جنگ نہ کریں گے، چنانچہ انھوں نے ہوائی جہاز کا انتظام کر لیا ہے تاکہ اگر جنگ شروع ہو تو وہ بھاگ کر امریکہ چلے جائیں۔

## پریسیڈنٹ امریکہ کی دفتری زندگی کسقدر مصروف ہے

موجودہ پریسیڈنٹ امریکہ (مسٹر روزویلٹ) اپنی صحت کے لحاظ سے خوش قسمت نہیں، لیکن پھر بھی اسکی دماغی و جسمانی مصروفیت حیرتناک حد تک بڑھی ہوئی ہے۔

ڈاک خانہ کی خاص موٹر کاروں کے ذریعہ سے روزانہ کم از کم پانچ ہزار خطوط وہائٹ ہاؤس (پریسیڈنٹ کے مکان) میں موصول ہوتے ہیں۔ ٹیلیفون کی گھنٹی ایک سکنڈ کے لئے بھی خاموش نہیں رہتی اور ہر طرح کے ملاقاتی ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ایک پرسنل اسٹاف میں چار سکریٹری خاص ہیں، تین مرد اور ایک عورت۔ ان کی ماتحتی میں ۱۶۰ مختصر نویس ٹائپسٹ ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ ہر سکریٹری کی خدمات علحدہ علحدہ مقرر ہیں ایک سکریٹری جو میک کے نام سے مشہور ہے پریسیڈنٹ اور پبلک کے درمیان واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتا ہے یا اپنے بڑے کمرے میں ہر وقت سگریٹ پیتا رہتا ہے اور ملاقاتیوں کے طوفان کا مقابلہ۔ اس کے اختیار میں ہے جسکو چاہے حضوری کا موقعہ دے اور جسکو چاہے ٹالدے۔ دوسرا سکریٹری جو اسٹیو کے نام سے مشہور ہے اور وائرلس اور پریس سے تعلق رکھنے والے کاموں کا انچارج ہے۔ خط و کتابت اسی کے سپرد ہے پریسیڈنٹ کے وہ بیانات جو اخبارات میں شایع ہوتے ہیں یہی مرتب کرتا ہے، یہی پریسیڈنٹ کی تقریروں کی تاریخیں متعین کر کے ان کی نقلیں اخبارات کو بھیجتا ہے۔

ہفتہ میں دو بار پریس کانفرنس، پریسیڈنٹ کے حضور میں منعقد ہوتی ہیں۔ اخباروں کے نمایندوں کا ایک ہجوم سامنے ہوتا ہے اور اسٹیو اپنے مالک کے پہلو میں کھڑا ہوا ہر سوال جواب کے متعلق مواد فراہم کرتا رہتا ہے۔

ایک خاتون سکریٹری بھی ہیں جن کا نام مس لی ہینڈ ہے، پریسیڈنٹ کے نجی خطوط کی دیکھ بھال ان کے ذمہ ہے پریسیڈنٹ خطوط کا جواب نہایت تیزی سے لکھواتا ہے، اس لئے مس لی کی مہارت مختصر نویسی بہت بڑھی ہوئی ہے یہ وہائٹ ہوس ہی میں رہتی ہیں اور خاندان روزویلٹ ہی کی ایک فرد سمجھی جاتی ہیں۔

چوتھا سکریٹری اُڈلف فارسٹر ہے ۔ اس کی حیثیت افسر تشریفات کی سی ہے، جو تمام عوایدِ رسمیہ کا انچارج ہے، سیاسی لوگوں کی ملاقاتیں اور سیاست خارجہ سے متعلق خط وکتابت سب اسی کے سپرد ہے ۔

## سب سے زیادہ پانی پینے والا جانور کون ہے

جہازوں کی ایجاد سے قبل جس طرح اونٹ اسباب کی نقل وحرکت کے لئے سب سے زیادہ مفید جانور سمجھا جاتا تھا اسی طرح اب پٹرول اور گیس کے زمانہ میں بھی مفید ہے، ریگستان کے رہنے والوں کے لئے اس کا وجود جہاز، ریل اور موٹر سب سے زیادہ کار آمد ہے ۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ریگستان کا جانور ہونے کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پیاسا رہتا ہے ۔ یہ صحیح نہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ کئی کئی دن تک وہ پانی نہیں پیتا لیکن اس کا سبب یہ نہیں کہ اسے پیاس نہیں لگتی، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں کئی کئی دن کا پانی پی لیتا ہے ۔ کوچ سے قبل اونٹ کو پانی میں نمک گھول کر پلاتے ہیں صرف اس لئے کہ اسے پیاس زیادہ لگے اور وہ پانی کا بڑا ذخیرہ اپنے اندر جمع کرلے ۔ اونٹ کے پیٹ میں تیس یا چالیس تھیلیاں ہوتی ہیں جن میں تین تین گیلن پانی سما جاتا ہے ۔ اونٹ ہر تھیلی کو جب جی چاہے کھول بند کر سکتا ہے، چنانچہ جب اس کو ہضم کے لئے پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ انھیں تھیلیوں سے پانی لیتا رہتا ہے اس طرح اُسے روز روز پانی پینے کی ضرورت نہیں رہتی ۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جب کبھی ریگستان میں پانی کی سخت ضرورت ہوتی ہے تو قافلے والے مجبور ہو کر اونٹ کا پیٹ پھاڑ ڈالتے ہیں اور اس سے پانی حاصل کرتے ہیں ۔ اسکا سبب یہی ہے کہ اسکے پیٹ میں پانی کا بڑا ذخیرہ موجود رہتا ہے جس سے وہ خود بھی کام لیتا ہے اور دوسرے بھی اس سے فایدہ اُٹھا سکتے ہیں

## انسانی اعضاء مرنے کے بعد کتنے عرصہ تک زندہ رہتے ہیں

مرنے کے بعد دماغ دس منٹ تک زندہ رہتا ہے، اعصاب قلب بیس منٹ، آنکھیں تیس منٹ، کان ایک گھنٹہ، ہاتھ پاؤں کے اعصاب چار گھنٹے، ذراتِ خون اٹھارہ گھنٹے، ہڈیاں تین دن اور کھال پانچ دن ۔

چنانچہ اب یورپ میں کوشش کی جارہی ہے کہ مرنے والوں کے ان اعضاء سے کام لیا جائے یعنی اگر کسی بیمار کو ان اعضاء میں سے کسی عضو کی ضرورت ہے تو کسی مردہ کے جسم سے اسی مدت کے اندر جس مدت تک وہ زندہ رہتا ہے، حاصل کر کے کام لیا جا سکتا ہے ۔ ایک زندہ انسان کا خون دوسرے انسان کے لئے حاصل کرنا تو عام بات ہے، لیکن اب مردہ جسم کے اعضاء کو بھی بیکار نہ جانے دیا جائے گا ۔

# پھول اور انگارے

**امیر :-**

ریشمیں پردے دروں کی بیل پر ہلتے ہوئے
مخملی قالیں کیا ہیں پھول ہیں کھلتے ہوئے
شربتی فانوس، رنگیں جھاڑ بجلی کے کنول
روشنی اتنی، کہ جیسے دھوپ آئی ہے نکل
جگمگاتے قمقمے ہیں کہکشاں در کہکشاں
قدِ آدم آئینوں میں کوندتی ہیں بجلیاں
خوشنما گلدان، رنگیں جام، چاندی کے گلاس
کی گئی ہے صرف، آرائش پہ دولت بے قیاس،

نقرئی سوفوں کے گل بوٹے ہیں فردوسِ نظر
دعوتِ نظارہ دیتے ہیں مطلا بام و در
مرمریں میزوں پہ گلدستے قطار اندر قطار
کس قرینے سے ہیں آویزاں مرقع زرنگار
رنگ و روغن سے ہیں دیواروں کے سینے جلوہ گر
اس مکاں کو عیش منزل کہیے یا آرام گھر
نرم بستر کی مسہری، خوشنما الماریاں
دہرِ فانی میں سدا رہنے کی ہیں تیاریاں
سُرخ پردوں میں لگی ہیں موتیوں کی جھالریں
رات کو دن کر رہی ہیں قمقموں کی تابشیں
فرشیاں رکھی ہوئی ہیں اور سگرٹ کیس بھی
اک نرالی شان ہے اپنی جگہ ہر چیز کی
چاندنی پر ایک سلوٹ بھی نظر آتی نہیں،
اس مکاں کا فرش ہے یا چاند تاروں کی زمیں
جھلملاتے ہیں سُنہرے عطردانوں کے غلاف
قابلِ نظارہ ہیں مرمر کی جالی کے شگاف،
گا رہی ہے گیت سے، بجلی کے پنکھے کی ہوا
پھول کے گجروں سے کس درجہ معطر ہے فضا،

مغربی تہذیب بھی ہے، مشرقی انداز بھی
تمکنت بھی، سادگی بھی، سوز بھی ہے ساز بھی

دیدنی ہیں نوکروں کی جگمگاتی وردیاں
کس تکلف سے چمکتی ہیں سُنہری پیٹیاں،
کس قرینہ سے صف آرا ہیں کمربستہ غلام
اللہ اللہ! اس مکاں کا طمطراق و اہتمام
دست بستہ، سر جھکائے ایستادہ ہیں ندیم
یعنی وہ وابستگانِ دامنِ فیضِ عمیم
جن کا مذہب زر پرستی، جن کی دُنیا "جی حضور"
جن کے سایہ سے بھی رہنا چاہئے انساں کو دور
جن کی باتوں کی گھلاوٹ، جن کے ہونٹوں کی ہنسی
سحر کارانہ بناوٹ، ایک جھوٹی زندگی

جو بنا سکتے ہیں اک انسان کو پروردگار / جن کی روزی کا جہاں میں چاپلوسی پر مدار
جمع ہیں کچھ بندگانِ زر پرست و بے ضمیر / جمگھٹے میں اُن کے بیٹھا ہے امیر ابنِ امیر
جس کے نتھنوں سے نکلتے ہیں تکبر کے شرار / جس کے تیور اُس کی فطرت کے ہیں خود آئینہ دار
جس کے ماتھے کی شکن سے کپکپا جاتے ہیں لوگ / جس کی محفل میں بڑی تعظیم سے آتے ہیں لوگ
جس کو لوگوں نے دیا ہے "ان داتا" کا خطاب / جس کی باتوں پر نہیں ہوتی مجالِ احتساب
جس سے کر سکتا نہیں کوئی سرِ مُو اختلاف / جس کی آنکھوں پر چڑھائے ہیں خوشامد نے غلاف

بند ہیں جس کے خزانے بدنصیبوں کے لئے
ٹھوکریں ملتی ہیں جس کے ہاں غریبوں کے لئے

## غریب :-

مونج کی رسّی یہاں بانسوں پہ ہے لپٹی ہوئی / پست دیواروں پہ اک بودی سی چھت رکھی ہوئی
فرش ناہموار، بوسیدہ ہیں چھپر کے ستوں / شرم آتی ہے، اسے میں کس زباں سے گھر کہوں
طاق میں رکھا ہوا ہے ٹمٹماتا سا چراغ / اس مکاں کی ہے فضا، ناواقفِ عیش و فراغ
بکریوں کے پاس ہی بچھی ہوئی ہے ایک کھاٹ / جس کے سرہانے رکھا ہے ایک بوسیدہ سا ٹاٹ
چند برتن چھاج، چھلنی اور لوہے کی پرات / بس یہی لے دیکے اس گھر کی ہے ساری کائنات
بیچ کے کوٹھے کی کھونٹی پر ٹنگی ہے ڈولچی / ہر طرف چھائی ہوئی ہے مفلسی ہی مفلسی
ایک کونے میں رکھا ہے بھاوڑا، کھرپا، کدال / جا بجا بکھرا ہوا ہے، بھونس، سینکیں اور پیال،
چند مٹی کے سکورے، چند پانی کے گھڑے / صحن میں ٹوٹی ہوئی اینٹوں پہ ہیں رکھے ہوئے
اک بھٹی دوہر ذرا اُجلی سی آتی ہے نظر، / ورنہ سچ یہ ہے دھوئیں میں رچ گیا ہے گھر کا گھر
ایک مٹی کا گھڑا رکھا ہے چولھے کے قریب / اس مکاں کے رہنے والوں کا جسے کہئے نصیب
راکھ پر اوندھی پڑی ہے ایک ٹوٹی سی چلم / ذرہ ذرہ پر یہاں کے یہ عبارت ہے رقم

ایں سیہ خانہ شعاعِ نیرِ عشرت نہ دید
کس دریں آبادیِ ویراں گلِ راحت نہ چید

ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا ہے کھاٹ پر / ہاتھ میں رسّی کے ٹکڑے بکریوں پر ہے نظر
وائے محرومی! کہ ہے کل کائنات اُس کی یہی / ایک میلا سا انگوچھا، اک پھٹی سی مرزئی،
جھریاں چہرے پہ پنڈلی کی نسیں اُبھری ہوئیں / زرد چہرہ، جسم لاغر، ہڈیاں نکلی ہوئیں

ڈالتا ہے گھر کے ساماں پر نگاہیں بار بار / سوچتا ہے کس طرح نبٹے گا، بنیے کا اُدھار
بیاہنے کے واسطے بیٹھی ہیں گھر میں بیٹیاں / جن کی قسمت میں لکھا ہے چھاج، چولھا، چکیاں
رہ گئی ہے گھٹ کے سینوں میں جوانی کی اُمنگ / جن کی اُمید دل پہ یہ دنیائے آب و گل ہے تنگ
بجھ چکا ہے خود بخود جن کی مسرت کا چراغ / رنج و کلفت کے اثر سے جن کے دل ہیں داغ داغ
غم کے ہاتھوں جن کا اس دنیا میں رہنا پاپ ہے / یہ اُنھی معصوم کنواری لڑکیوں کا باپ ہے
جو بہاتا ہے پسینہ چلچلاتی دھوپ میں / موت جس پر ہنس رہی ہے، زندگی کے روپ میں
اس بڑھاپے میں بھی جس کو چین مل سکتا نہیں / جس کی دُنیا کھیت، تھوڑا سا نمک، نانِ جویں

یہ تمدن جس کو ٹھکراتا ہے اک اک گام پر
بھیک بھی ملتی نہیں جس کو خدا کے نام پر

## خدا :-

اے خداوندِ کریم، اے خدائے ذوالجلال / اہلِ دولت کر رہے ہیں مفلسوں کو پائمال
چھا رہا ہے دہر پر سرمایہ داری کا غرور / اس جہاں میں رہ نہیں سکتا کوئی مردِ غیور
زندگی فریاد و ماتم ہے غریبوں کے لئے / یہ تری دُنیا جہنم ہے غریبوں کے لئے
تیرے بندے آج بھی پامال ہیں، برباد ہیں / اس جہاں میں سیکڑوں نمرود اور شداد ہیں
اہلِ دولت یعنی وہ نادار بندوں کے خدا / بندھ رہی ہے دہر میں جن کے تکبر کی ہوا
ہو گئے ہیں سخت پتھر سے سوا جن کے ضمیر / جو سمجھتے ہیں غریبوں، زیردستوں کو حقیر
جن کے مذہب میں کسی پر رحم کھانا ہے گناہ / مسکرا دیتے ہیں، جو سن کر غریبوں کی کراہ
جن کے در پر جبہ سا ہوتے ہیں نادار و ضعیف / جن کی نخوت بن گئی، تیری خدائی کی حریف
جوش میں آئے گی آخر کب تری شانِ جلال / تا بکے یہ بے نیازی اور اظہارِ جمال،
راس آئی ہے یہ دُنیا دولتِ بیسود کو، / ڈھیل دی جائے گی کب تک طاقتِ نمرود کو
ابرِ رحمت میں رہے گی تا بکے برقِ عتاب / نخوتِ دولت کو کب دے گی تری غیرت جواب
تجھ کو کہتا ہے زمانہ مالداروں کا خدا / ہے تلاطم میں تری انمٹ خدائی کی فضا،
لوگ کہتے ہیں خدا اب دخل دے سکتا نہیں / سرکشوں کے ظلم سے بدلہ بھی لے سکتا نہیں

قہر کے پُرشور طوفاں کس لئے آتے نہیں
میرے مولا! مجھ سے یہ طعنے سنے جاتے نہیں

ماہر القادری۔

# پیامِ ناظر

## (لکھنؤ کے شیعہ سُنیوں کے نام)

یاد ہیں وہ دن بھی تجھ کو اے دیارِ لکھنؤ — رشکِ گلزارِ ارم تھی جب بہارِ لکھنؤ
بزمِ قیصر باغ کے لیل و نہارِ لکھنؤ — جانبِ دریا وہ سیمیں سبزہ زارِ لکھنؤ
بانکپن ناز و ادا - خوبی و محبوبی میں فرد — جانِ عالم تھا کبھی تو اے نگارِ لکھنؤ
تھا کبھی تو مرجع و ماوائے اربابِ کمال — سرمۂ چشمِ بصیرت تھا غبارِ لکھنؤ

آہ - وہ فخر البلاد اب عرصۂ پیکار ہے
شہر میں جوتی اُچھلتی بر سرِ بازار ہے

اہلِ دانش ہموطن اب کار فرما بن گئے — مسندِ عزّ و شرف کے مسند آرا بن گئے
ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اب حکومت کی عنان — اور مسلم ملزمِ مدح و تبرّا بن گئے
اک زمانہ ان کی وحشت کا تماشائی ہوا — لکھنؤ کے سُنی و شیعی تماشا بن گئے

شاہِ ایراں کا اُدھر یہ مصر کو پیغام ہے
سنّی و شیعی میں باہم رشتۂ اسلام ہے

اب وہ شان و شوکتِ اسلامیاں باقی نہیں — ملّتِ مرحوم کے قالب میں جاں باقی نہیں،
جس کے در پر قیصروں کی گردنیں ہوتی تھیں خم — اُس خلافت کا زمانہ میں نشاں باقی نہیں،
یادِ گل میں بلبلِ ناشاد کب تک روئے گی — جب وہ فصلِ گل وہ رنگِ گلستاں باقی نہیں

زندہ قومیں فکرِ مستقبل کے پیچ و خم میں ہیں
مردہ دل مسلم ابھی ماضی کے ہی ماتم میں ہیں

نسلِ آدم کا ہوا تھا ارتقا اسلام سے
کس بلندی سے گرے ہم گردشِ ایام سے

جب دلِ آزاریٔ شیعہ مدح کا مقصود ہو
فایدہ۔ اے سنیوں اس مدح ذم انجام سے

گالیاں دینا خلافِ مذہب واخلاق ہے
پاک رکھ اپنی زباں آلایشِ دشنام سے

دین و ایماں کا تعلق جب دلِ مومن سے ہے
فایدہ ہنگامہ ہائے شاہراہِ عام سے

اتحادِ قوم کی لاہور میں دیکھیں بہار
جان و دل سنی کا ہے نواب شیعی[1] پر نثار

دشت میں حضرِ رہِ گم گشتگاں کوئی نہیں
ان میں اب منزل شناسِ کارواں کوئی نہیں

خلقِ مصطفوی کی آیت ہے "علیٰ خلقِ عظیم"
لیکن اس عظمت کا امت میں نشاں کوئی نہیں

جذبۂ ایثار میں ہے رازِ تقدیرِ امم
اب مسلمانوں میں لیکن راز داں کوئی نہیں

کشتیٔ مسلم کے حق میں ہے یہی بادِ مراد
اتفاق و اتفاق و اتحاد و اتحاد

اپنے مسلم بھائیوں کا دل دکھانا چھوڑ دو
اے مسلمانو! یہ بغض کا فرانہ چھوڑ دو

ہو گئے ہندو اچھوتوں سے بھی جب شیر و شکر
سنی و شیعی کا تم فتنہ جگانا چھوڑ دو

لگ رہی گلشن میں ہے اس شعلہ افشانی سے آگ
مدح و ذم کا بلبلو رنگیں ترانہ چھوڑ دو

ہے مسلماں کا خدا بھی ایک پیغمبر بھی ایک
ہمدمو اس نقشِ وحدت کا مٹانا چھوڑ دو

مضحکہ اسلام کا اور جگ ہنسائی ہو چکی
صلح کی ٹھہرایئے اب تو لڑائی ہو چکی

(خان بہادر) خوشی محمد ناظر بی۔ اے (چودھری)

---

[1] نواب نثار علی خاں صاحب قزلباش رئیس اعظم لاہور و حامی حمایت اسلام کی طرف اشارہ ہے۔

---


## تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

### کتابی شکل میں

نگار سایز کے ۲۴۳ صفحات پر۔ قیمت معہ محصول ۱۲؏۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

# مشعلِ بصیرت

رفعتوں کے دامنوں میں پستیاں پاتا ہوں میں
آئینے میں پھول کے عکسِ خزاں پاتا ہوں میں

آنسوؤں میں مسکراتی ہے عروسِ زندگی
غم کے پردے میں خوشی کی جھلکیاں پاتا ہوں میں

سانس لیتے ہیں ہر اک ذرے میں خورشید و قمر
ہر نفس زیرِ قدم اک آسماں پاتا ہوں میں،

ظلمتوں کے دائرے میں مسکراتی ہے سحر
عارضِ شب میں شفق کی سرخیاں پاتا ہوں میں

رقص کرتا ہے ہر اک شبنم کے قطرے میں گہر
ہر خزف میں ایک تاجِ زرفشاں پاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں کروٹیں لیتا ہوا میں خاک کو
قلب میں ہر خواب کے بیداریاں پاتا ہوں میں

ماہِ کامل جب ابھرتا ہے سہانی رات میں
ذرہ ذرہ کو زمیں کے نوجواں پاتا ہوں میں

رُخ سے کانٹوں کے ٹپکتا ہے شگوفوں کا شباب
بجلیوں کے پہلوؤں میں آشیاں پاتا ہوں میں

ہر نفس دنیا سے کہتے ہیں حدیثِ آفتاب
سنگ ریزوں کے دہن میں بھی زباں پاتا ہوں میں

مُرتعش ہے ساز میں ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
مسکراہٹ کی جلو میں سسکیاں پاتا ہوں میں

ہے صبا کے دل میں خوں آشام تلواروں کی دھار
نرم رو موجوں کے سینے میں دھواں پاتا ہوں میں

گونجتے ہیں طبل و نقارے جہاں پر روز و شب
اُس فضا میں گرمیِ آہ و فغاں پاتا ہوں میں

دوڑتا ہے نبضِ آہن میں گلستاں کا لہو
زندگی کی، موت میں پرچھائیاں پاتا ہوں میں

سرنگوں ہے میرے آگے نظمِ دنیا کا سروشؔ
اپنے سینے میں رموزِ دو جہاں پاتا ہوں میں

سروشؔ ملیح آبادی

# مومن ذخیرہ نہ کند

خواجگی کا قصر ہے عہدِ جنوں کی یادگار
وہم زائیدہ خداؤں کے فسانوں کا مزار

خونِ انسانی کا طوفانی سمندر ہولناک!
آہ! نمرودوں کی بستی آہ! فرعونوں کی خاک

معصیت کاری کی دنیا، زہر کا خوش رنگ جام
ابنِ آدم کی تباہی کا طلسماتی نظام

فرقہ سازی کا جنازہ، گرگ زادوں کا نقاب
سر سے پا تک رات کے تاریک لمحوں کا عذاب

اس کے سائے میں یہاں غدار پاتا ہے فروغ
روزِ روشن کی طرح سے جگمگاتا ہے دروغ

یہ مکانِ کہنہ و فرسودہ ڈھانا چاہیے!
گمرہوں کو جادۂ عرفاں دکھانا چاہیے!

[illegible]

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

# نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

## ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری او
غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و
نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے
ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہی
کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج
ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج
میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو
حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

## مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں سنہ ۲۲ء سے لیکر
سنہ ۳۲ء تک کے استفسار و جواب
شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت
کا اظہار بیکار ہی کیونکہ نگار کو جو خصوصیت
اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے
مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں
سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی،
مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت
ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے) علاوہ محصول
خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

## جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ
تمہید کے ساتھ بہترین
ہندی شاعری کے نمونے پیش
کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے
کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو
میں یہی سب سے پہلی کتاب اس،
موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی
کلام کے بے مثل نمونے نظر
آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲/)
خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

## فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے
تین علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ
۲۔ مادئین کا مذہب
۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ
کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

## شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا
لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق
کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے
ایک ایک جملہ میں موجود ہیں،
یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور
انشاء کے لحاظ سے اس قدر
بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ
اس کی نظیر نہیں مل سکتی

قیمت دس آنے (۱۰/)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے دو آنہ (۲/) کم

## فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ
سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی
شناخت اور اس کی لکیروں کو
دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے
مستقبل سیرت عروج و زوال،
موت و حیات، صحت و بیماری،
شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح
پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے چار آنہ (۴/) کم

## مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو
ادبیات و تنقید عالیہ کا
عجیب و غریب ذخیرہ ہے
ایک بار اس کو شروع
کر دینا آخر تک پڑھ لینا
ہے۔ اس کتاب کی
بہت کم جلدیں باقی
رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲/)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے تین آنہ (۳/) کم

## گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں
تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے
کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا
زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب
شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے
اردو میں اس موضوع پر اس سے
قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف
کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے
ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ/)
علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

# نفیس المزاج لوگ

## طب یونانی سے کیوں برداشتہ خاطر ہیں

صرف اس لئے

## کہ بعض دواخانے دوائیوں سے زیادہ کوڑے کرکٹ کا گھر بنے رہتے ہیں مگر بفضلہ

طیبی دواخانے میں صفائی کا بہترین انتظام ہے۔ مرکبات سائنٹفک طریقہ پر تیار کئے جاتے ہیں جن کی عمدگی اور نفاست مسلمہ ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر دواخانہ کا معائنہ فرما کر اپنی بہترین رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے خاص مرکبات اور صدری نسخہ جات طب یونانی کا معجزہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ فہرست مفت۔ آزمائیے اور

طب یونانی کی سرپرستی فرمائیے!

قایم شدہ ۱۸۱۵ء
چوک بازار۔ اندور
تار کا پتہ "شاہی" اندور

## طیبی دواخانہ یونانی

قایم شدہ ۱۸۱۵ء
۶۶ محمد علی روڈ بمبئی ۳
ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳